

عصمت چغتائی
(23)

عصمت چغتائی کی ناول نگاری



شبنم رضوی

والدین فیروز دکن
27-7-94

53-70

کتاب	صفحہ	توضیح
71-89	ص	شمن
89	ص	نحو
91	ص	نظم
92	ص	پند و اندرز
96	ص	رائے صاحب
100	ص	(افتخار)
106	ص	رشد
107	ص	رفیق بنو
110	ص	ایمان
118	ص	رسمائے خاتم
114	ص	نظم
118	ص	بلقیس
120	ص	کنز انوار
121	ص	ابحار/بحار
123	ص	شمن کمال مجلسک مان

کامیاب فیروز دکن

افتخار 100
بلقیس 118
پند و اندرز

میں

✓

شادی - 224
افتخار

کامیاب فیروز دکن
شاعر ایروڑ

عصمتِ چغتائی کی ناول نگاری

ٹیڑھی لکیر کی روشنی میں

شبہم رضوی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ



عصمت چغتائی کی ناول نگاری
(ٹیڑھی لکیر کی روشنی میں)

شبیم رضوی

اشاعت :	اول
سن اشاعت :	ستمبر ۱۹۹۲ء
تعداد :	چھ سو
ناشر :	شبیم رضوی
قیمت :	پچاس روپے
کتابت :	عبدالغفار، فیاض احمد
طباعت :	نیو پبلک پریس۔ دہلی ۱۱۰۰۶
تقسیم کار :	نصرت بلیشرز، حیدری مارکیٹ این آباد لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸
	شبانہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ محلہ قبرستان، ترکمان گیٹ دہلی ۱۱۰۰۶
	بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ - ۸۰۰۰۰۴

آہی کے نام

یہ کتاب فخر الدین علی احمد میوہیل کمیٹی حکومت اتر پردیش لکھنؤ کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی

عِصْمَت کی ناول نگاری

ٹیڑھی لکیر کی روشنی میں

شبہم رضوی

۱۱	۱۔ اپنی بات
۱۵	۲۔ جراتِ تشواں اور عصمت
۳۳	۳۔ عصمت چغتائی کے ناولوں کا بتدریج ارتقار
۵۱	۴۔ ٹیڑھی لکیر میں قصہ اور پلاٹ
۶۹	۵۔ ٹیڑھی لکیر میں کردار نگاری
۱۱۵	۶۔ ٹیڑھی لکیر میں بعض نفسیاتی الجھنیں
۱۵۷	۷۔ ٹیڑھی لکیر کا اسلوب و زبان
۱۸۳	۸۔ ٹیڑھی لکیر میں فلسفہ حیات
۱۹۷	۹۔ عصمت چغتائی کی تصنیفات کی فہرست
۲۰۵	۱۰۔ کتابیات

اپنی بات

عصمت کے تخلیقی سحر کا اسیر ہو جانا کوئی خاص بات نہیں۔ وہ لکھتی ہی ایسا ہیں کہ جس نے ان کو غور سے پڑھ لیا وہ ان کی تحریروں میں گم ہو گیا۔ آج مجھے اس پر رشک آتا ہے کہ میں عصمت چغتائی کے تخلیقی کارناموں سے کسی حد تک واقف ہوں۔ میں نے عصمت کے افسانے کب پڑھنا شروع کر دیے یاد نہیں۔ بس اتنا یاد ہے جو ملا جہاں ملا پڑھا۔ ہندی اردو اور انگریزی جس زبان میں بھی ملا پڑھا۔ جب ان کی تخلیقی تحریریں نہیں ملتیں تو ان کے افسانوں اور ناولوں پر تقدیر نے جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھ لیتی۔ غرض کہ نہ جانے کیا کیا پڑھا اور تو اور عصمت آپا کے چکر میں نفسیات سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور فریڈ یونگ اور ایڈلر کو پڑھ کر عصمت آپا کی کہانیوں اور ناولوں کو سمجھنے کی کوشش کی اور سمجھ جانے کے واسطے میں مبتلا ہو گئی۔

یہ اتفاق ہی ہے کہ میں نے عصمت کو 'لحاف' سے نہیں بلکہ 'ٹیرھی لکیر' سے پڑھنا شروع کیا۔ اس ناول کو پڑھ کر میں نے عجیب سی بے چینی محسوس کی اور میں وہ فرسٹریشن تلاش کرنے لگی جو ٹیرھی لکیر کی ہیروئن شمن میں موجود تھا۔ ناول کے انتساب ان ہیروئنوں کے نام جن کے والدین بقید حیات ہیں، کو دیکھ کر کچھ سمجھ میں آیا لیکن جب تک میں کچھ سمجھنے کا دعویٰ کرتی ذہن سے نکل گیا۔ میں جو کچھ تھوڑا بہت سمجھی وہ اس طرح ہے۔

'انحراف' کو ایک لائحہ عمل اور طرز عمل کے طور پر جینے کا قصد اس ناول کی بنیاد ہے۔ اسی انحراف کو COMMITED STRETAGY بنا کر پیش کرنے کی کامیاب سعی نے اسے شاہ کار کا درجہ عطا کیا ہے۔ "لکیر" کسی شے کے گنگلک اور طرح دار ہونے کا تصور نہیں دیتی، لکیر کا سیدھا اور واضح تصور ذہن میں ابھر رہا ہے۔ DEMAK - CATION - کا "لکیر" نشاندہی، وضاحت، سادگی، سیدھا پن، معصومیت، نادانی،

بے حسی اور بے حرکتی وغیرہ کا عکس پیش کرتی ہے لیکن جب اس میں کچ پیدا ہو جائے
طرح پیدا ہو جائے اور یہ ٹیڑھی ہو جائے تب ۔۔۔۔۔۔؟ شمن بن جاتی ہے ۔۔۔۔۔۔!
شمن جسے عصمت چغتائی نے آٹھ دس لڑکیوں کو ملا کر بنایا ہے اور ایک لڑکی کو اوپر
سے ڈال دیا ہے، یہ ایک لڑکی کوئی اور نہیں وہ خود ہیں۔ انہوں نے خود لکھا ہے

”کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ٹیڑھی لکیر میری آپ بیتی ہے۔۔۔۔۔۔
خود آپ بیتی لکھتی ہے۔ میں نے اس ناول کو لکھتے وقت بہت کچھ محسوس
کیا ہے۔ میں نے شمن کے دل میں اترنے کی کوشش کی ہے، اس کے
ساتھ آنسو بہائے ہیں اور قہقہے لگائے ہیں۔ اس کی کمزوریوں سے جل بھی
اٹھی ہوں۔ اس کی ہمت کی داد بھی دی ہے۔ اس کی نادانیوں پر رحم بھی آیا ہے
اور شرارتوں پر پیار بھی آیا ہے۔ اس کے عشق و محبت کے کارناموں پر چٹخائے
بھی لئے ہیں اور حسرتوں پر دکھ بھی ہوا ہے۔ ایسی حالت میں اگر میں کہوں کہ
یہ میری آپ بیتی ہے تو کچھ زیادہ مبالغہ تو نہیں۔۔۔۔۔۔“

عصمت نے یہ ناول تب لکھا جب وہ پہلی مرتبہ ”شمن بخشی“ کے مرحلہ اعزاز سے گذر کر سرخرو
ہونے والی تھیں۔۔۔۔۔۔! میں نے عصمت کی ناول نگاری کا مطالعہ اسی ناول کی روشنی
میں کیا ہے۔ اس ناول کے ہر گوشے کو خوب سمجھنے کی کوشش کی ہے، ہر پہلو سے۔ میں
کتنی کامیاب ہوئی ہوں۔ نہیں جانتی، کتاب پڑھنے والے بتائیں گے۔

کتاب کے دو باب ”عصمت چغتائی اور حرات نسواں“ اور ”ٹیڑھی لکیر میں نفسیاتی
الجھنیں“ مجھے بہت عزیز ہیں کیوں کہ میں نے ان دونوں ابواب میں بہت محنت کی ہے نفسیاتی
الجھنوں میں الجھ بھی گئی ہوں۔ مجھے یہ باب اغلاط نامہ نظر آتا ہے تو کبھی کبھار اور۔۔۔۔۔۔ جو کچھ
بھی ہے قارئین کے سامنے ہے۔

ایک نتیجہ میں نے یہ بھی اخذ کیا ہے کہ عصمت ہزار کوششوں کے باوجود فرائڈ کے
نظریہ سے انحراف نہیں کر پائی ہیں۔ ان کے بقول فرائڈ کہتا ہے کہ انسان میں کچ پیدا
ہونے کی وجہ جنس ہے جبکہ عصمت اسے یوں جھٹلاتی ہیں کہ ماحول انسان کو بناتا
ہے۔

کتاب لکھنے کا مقصد مصنف کے طور پر اپنی پہچان بنانا ہرگز نہیں کیونکہ کتاب چھپوا کر کسی طرح کی ادبی پہچان ہو ہی نہیں سکتی۔ کتاب کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جو کام میں نے کیا ہے وہ دوسروں تک پہنچے خصوصاً اساتذہ تک۔

شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے ریڈرا اور میرے کرم فرما ڈاکٹر صادق کی میں خصوصی طور پر ممنون ہوں کہ اس مسودے کی تیاری میں انہوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی ان کی نگرانی میں یہ کام انجام پایا۔ ڈاکٹر قمر تیس کی بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے مفید مشورے دئے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، کہ جن کی صحبتوں نے مجھے اردو کے آداب اور سلیقے سکھائے اپنی اس خوش نصیبی پر آج بھی نازاں ہوں کہ علوی صاحب کے قدموں میں بیٹھ کر میں نے نثر اور ادب کے اسرار و رموز جانے سمجھے۔
 Plb. No. 32685³⁹
 Rem

اس کتاب کی اشاعت کے لئے جو حوصلہ درکار تھا وہ میرے ماموں راہی معصوم رضا (مرحوم) نے دیا۔ ان سے لمبی لمبی بحثوں کے بعد ہی میں اس کتاب کو مکمل کرنے اور چھپوانے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر پائی۔ مونس ماموں اور امیر ماموں نے میرے لئے تمام راستے آسان کئے۔ شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے سینئر اسکالر ڈاکٹر مظہر احمد کی بھی شکر گزار ہوں کہ مسودے کی تیاری میں انہوں نے میری مدد کی۔
 کتاب جب کتابت کے مرحلے میں تھی تبھی عصمت آپا کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد جو خصوصی نمبر شائع ہوئے ان میں بعض اطلاعات میرے لئے نئی تھیں۔ بہت کباتیں میں اس کتاب میں شامل کرنا چاہتی تھی جو ان کے انتقال کے بعد میرے ذہن میں آئیں۔ لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا کیونکہ کچھ نئے ابواب کا اضافہ کرنا پڑتا۔
 آخر میں ان سب حضرات سے ایک گزارش جو اس کتاب کو پڑھیں کہ اپنی رائے سے نوازنے کی زحمت کریں، جو گمیاں نظر آئیں ان کی نشاندہی ضرور کریں۔ میں ان سب کی ممنون رہوں گی۔

شبیم رحمنوی

جرات نسواں اور عصمت چغتائی

ہر تخلیق کار کی تخلیق میں اس کی اپنی شخصیت عادت اور خیالات کی جھلک آہی جاتی ہے۔ اگر فن کار رومانی ذہن کا مالک ہے تو رومانیت اس کی تحریر میں چھائی رہے گی اسی طرح اگر فن کار کی شخصیت الجھی ہوئی اور پیچیدہ ہے تو اس کے کردار یا تحریر بھی زیادہ الجھی ہوئی، پریشان، بکھری بکھری سی نظر آئے گی۔ یا پھر بھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان بظاہر جیسا نظر آتا ہے تخلیق اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔

ایک فن کار وہ ہے جو اپنے خیالات کو اپنے کرداروں میں پیش کرتا ہے اور ایک فن کار وہ ہے جو اپنے کردار کو اپنے آپ کو اپنی تخلیق میں پیش کرتا ہے مگر جہاں تک عصمت چغتائی کا تعلق ہے انہوں نے اپنے اندر کی ضد، اکھڑ، بغاوت، جرات اور جستجو کو جگہ جگہ اپنے ناولوں اور افسانوں کے کرداروں میں پیش کیا ہے ان کے ناولوں کی ہیروئنوں کے اندر عصمت ہر جگہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی روپ میں نظر آتی ہیں۔ چاہے وہ معصومہ کی بیگم صاحبہ ہوں یا سودانی کی چاندنی باندی کی حرمہ یا گوری بیوی یا طیرھی لکیر کی شمن یا پھر دل کی دنیا کی قدسیہ خالہ ہوں۔

عصمت چغتائی بچپن سے ہی ضدی اور منہ پھٹ رہی ہیں۔ اپنا حق لینا اور حق کے لئے لڑائی کرنا انہوں نے بچپن سے ہی سیکھا ہے۔ عصمت اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی تھیں اس طرح جب بہنوں میں جاتیں تو وہاں چھوٹا سمجھ کر بھگایا جاتا اور جب بھائیوں میں کھیلنے کو جاتیں تو وہاں سب ان کو لڑکی کہہ کر بھگانا چاہتے مگر عصمت ڈٹی رہتیں اور بھائیوں کے ساتھ ہانکی، فٹ بال، گلی ڈنڈا کھیلیں اور پینکیں اڑاتیں۔ ان کے کردار میں ہمیں جو اکھڑ پن نظر آتا ہے اس کی وجہ بھی شاید بھائیوں کے ساتھ کھیلنا ہی تھا۔ عصمت بچپن ہی سے ہٹ دھرمی اور نٹ کھٹ تھیں اور ضد کی کمی بھی۔ مجال ہے جو کوئی ان کے ساتھ نا انصافی کر جائے اپنے بچپن کا ایک واقعہ وہ یوں بیان کرتی ہیں۔

”گھر میں بچوں کی ہوا خوری کیلئے ایک ٹوٹا تھا۔ سفید۔ میں نے کہا میں بھی جاؤں گی۔ اماں نے کہا۔ لڑکیاں گھوٹے پر نہیں چڑھتیں۔ آبا کو معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے گھوٹے پر بٹھایا اور کہا۔ یہ جایا کرے گی۔ پھر میں اپنی باری لیا کرتی تھی۔ اس وقت میری عمر چار پانچ سال کی تھی۔“

عصمت جاہلانہ باتوں اور بوسیدہ رسم و رواج کے خلاف تھیں۔ ان باتوں سے بغاوت کرنا انہوں نے بچپن سے ہی سیکھ لیا تھا۔ بغاوت جہاں بری چیز ہے وہیں بہت کارآمد چیز بھی ہے۔ چونکہ عصمت چنگیز کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اس وجہ سے بھی ان کا ذیل ڈول بہت اچھا تھا۔ اور کم عمری میں ہی وہ بڑی دکھائی پڑنے لگی تھیں اس وجہ سے ایک ڈپٹی صاحب جن کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا عصمت سے شادی کرنے کے خواہش مند تھے۔ عصمت کی والدہ تو بہت خوش ہوئیں بالکل ہندوستانی عام ماؤں کی طرح فوراً بغیر یہ دیکھے کہ لڑکے کی عمر کیا ہے موٹا ہے دبلا ہے کالا ہے یا گورا یا پھر بوڑھا ہے یا بچہ۔ اس سے حامی بھرنے کو تیار ہو گئیں جب یہ بات عصمت تک پہنچی تو ان کا باغی کردار بغاوت پر اتر آیا۔

”عصمت نے اپنی والدہ سے کہا کہ اگر میری شادی اس سے کر دی گئی تو میں بھاگ جاؤں گی اس بات کا ان کی والدہ پر بہت اثر ہوا۔ انہوں نے فوراً یہ بات عصمت کے والد کو بتائی انہوں نے عصمت کو بلا کر پوچھا۔ کیوں بھی کیا بات ہے تو انہوں نے کہا کہ میری شادی وادی کی تو میں یہاں سے بھاگ کر عیسائیوں کے پاس چلی جاؤں گی اور عیسائی بن جاؤں گی۔ کیونکہ میں نے سنا ہے کہ وہ ایسے بچوں کو پناہ دیتے ہیں یہ سن کر والد ہنسے اور کہنے لگے

”اچھا ابھی تمہاری شادی ڈپٹی سے نہیں کریں گے۔“

بچپن میں شادی سے انکار کر کے عصمت نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ بے میل شادی اور راکن کی شادی کے خلاف ہیں اور اس سے ہونے والے نقصانات کا ذکر انہوں نے ”لحاف“ جیسے افسانے میں کیا ہے۔

عصمت چغتائی کا خاندان تعلیم یافتہ خاندانوں میں شمار ہوتا تھا ان کے نانا بھی ادیب تھے اس کے علاوہ عصمت کے بھائیوں نے بھی ادب کے میدان میں قسمت آزمائی کی مگر سوائے عظیم بیگ چغتائی کے اور کسی کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ عظیم بیگ چغتائی

اور نادلوں کی ہیروئن بھی الٹ، نٹ کھٹ، ہندی اور باغی ہوتی ہے۔ عصمت کی ہیروئن زندگی سے سمجھوتہ تو کرتی ہے مگر اپنے وقار کو قائم رکھتے ہوئے وہ مردوں کے اس سماج سے اپنے حقوق کو مانگتی اور چھینتی نظر آتی ہے وہ باغی بھی ہے اور بھولی بھی۔ عصمت کی ہیروئن کی جرات، عمل، سوچ اس کا تخیل اور ہمت دیکھنی ہو تو ان نکل نادلوں کا مطالعہ کیجئے جو معصوم بھی ہوتی ہے بدتمیز بھی اسے حق کیلئے جان دینا بھی آتا ہے تو حق کے واسطے وہ جان لے بھی لیتی ہے۔ عصمت کی ہیروئن تعلیم یافتہ ہو یا گھر بلو عورت اپنے حق سے انجان بھی نہیں رہتی۔ ان کی نادلوں میں چند نسوانی کردار اپنی جرات کی وجہ سے تمام اردو نادلوں میں ایک مثال بن گئے ہیں۔ انہی جاں باز کرداروں میں ”ہندی“ کی سانتا ”معصومہ“ کی بیگم صاحبہ ”سیدھی لکیر“ کی شمن ”دل کی دنیا“ کی قدسیہ خاں ”سودانی“ کی چاندنی ”جنگلی کبوتر“ کی عابدہ ”باندی“ کی گوری بیوی اور حریمہ و خفیرہ چند ایسے کردار ہیں جنہوں نے زندگی کی سیدھی سادی سڑک کو پار کرنے کے بجائے اپنے لئے راستے کا انتخاب خود کیا ہے اور اس پر چل کر کامیاب بھی ہوتی ہیں۔

عصمت کے نادلوں کی ہیروئن

”معصومہ“ ناولٹ میں عصمت نے ملک بٹوارے کے وقت جاگیردارانہ گھرانوں پر آنے والی آفت و پریشانیوں کا ذکر ایک نئے انداز میں کیا ہے۔ اس ناول کی کہانی کچھ اس طرح ہے کہ معصومہ کے والد فوج میں نوکر تھے جب ملک کا بٹوارہ ہو گیا تو انہوں نے زمین جائیداد بیچ کر اور اپنے تینوں بڑے بیٹوں کو لے کر پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا مگر جانے کے بعد مدت تک خاموش رہے ہندوستان میں ان کی ”بیگم صاحبہ“ تین لڑکیوں اور ایک چھوٹے لڑکے کے ساتھ رہ جاتی ہیں اور تپ شروع ہوتا ہے مصیبتوں کا سلسلہ۔ بیگم صاحبہ نے پہلے تو گنڈارے کے لئے گھر کا سامان فروخت کیا۔ پھر زبورات بیچے مگر کسی بھی حالت میں پاکستان سے ان کے شوہر کا بلاوا نہ آیا۔ بیبی خاموشی ایک خط کے ذریعہ ٹوٹتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے شوہر نے انیس برس کی ایک لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ لڑکے بھی اپنا گھر بسا چکے ہیں اور حد تو تپ ہوئی جب ان کے شوہر نے لکھا کہ وقت پڑنے لگا وہ انہیں طلاق بھی دیدیں گے۔ اس حادثے سے بیگم صاحبہ کو بہت گہرا صدمہ پہنچتا ہے وہ اندر سے ٹوٹ جاتی ہیں۔ اس غم و غصہ کا اظہار وہ

روپیٹ کر کرتی ہیں اور اس ظالم سماج سے اپنا حق مانگتی ہیں اپنا سہاگ مانگتی ہیں نصیب چاہتی ہیں مگر ان کی آواز و فریاد ظالم سماج کے کانوں تک نہیں پہنچ پاتی۔ وہ روتی رہتی ہیں۔ گڑگڑاتی رہتی ہیں مگر جلد ہی انہوں نے اس ظالم سماج کے سامنے روزنامہ سب نہ سمجھا اور تب ان کے زخمی ضمیر کے اندر سے ایک نئی اور باغی عورت کا جنم ہوتا ہے جو روتی نہیں، تڑپتی نہیں کسی سے اپنا حق مانگتی نہیں بلکہ جو کچھ چاہتے وہ اسے جائز یا ناجائز طریقہ سے بہر صورت اس بے درد سماج سے چھین لیتی ہے۔

بیگم صاحبہ نے گھر کا خرچ چلانے، بچوں کو پالنے، مکان کا کرایہ ادا کرنے کیلئے جو راستہ نکالا وہ قابلِ رحم بھی ہے اور قابلِ تعریف بھی۔ بیگم صاحبہ نے اپنی انیس برس کی بیٹی معصومہ کو طوائف بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ سائنہ نہ صرف اردو ناول نگاری کے لئے ایک نیا تجربہ تھا بلکہ اس حقیقی زندگی کے لئے بھی بہت اٹھکھٹی بات تھی جس کے اندر ایک سوال چھپا تھا کہ "لو اگر تم کسی کی مجبوری کی وجہ سے انیس برس کی لڑکی سے شادی کر سکتے ہو تو تمہاری بیٹی بھی مجبوری میں طوائف بن سکتی ہے۔" یہ بات پورے مرد سماج کے منہ پر ایک طمانچہ تھی اور تب جب کہ وہ معصومہ کا سودا کر رہی تھیں ایک بے باک نائیکہ کی طرح ان کے اندر نہ جھمک ہوتی ہے نہ شرم وہ کہہ اٹھتی ہیں "فلٹ پچی کے نام ہوگا۔ ایک ہزار کا بندھا خرچ ہے۔ لڑکی بغیر ان کی مرضی کے رات کو باہر نہیں رہے گی۔"

یہ وہی ماں ہے جس نے اپنے ممتل کے آپنل میں چھپا کر اسے بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا جس نے انیس برس تک ناز برداری کی تھی اپنے خون سے اس ننھے سے پودے کو سینچ کر بڑا کیا تھا جسے بار بار دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھنے کی ہدایت دی تھی جس کے کھل کر قہقہے لگانے پر اعتراض کیا تھا جس کی شادی کے لئے بچپن سے ہی رشتے آنے شروع ہو گئے تھے اور قرآن شریف سے دیکھ کر اس کا نام معصومہ رکھا گیا تھا اسی لاڈ کی بیٹی کو ایک ماں طوائف بنا رہی تھی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس ماں میں ممتا کا فقدان تھا۔ وہ پیار کے جذبات سے محروم تھی۔ نہیں آج بھی ممتا میں فرق نہیں ہے امتداد وہ تو صرف حالات سے لاچار اور روزی روتی سے مجبور تھی۔ وہ اپنی بیٹی سے

شرمندہ بھی تھیں تبھی تو معصومہ کو سوتا ہوا دیکھ کر سوچتی ہیں۔

”آج اس سے کیوں کر کہیں کہ اب تیرے سوا زندگی کا اور کوئی سہارا نہیں بچھے
قربانی دینا ہوگی۔ چھوٹے بہن بھائیوں کی ناقابل لگانے کیلئے تیار بننا ہوگا۔“
بیگم صاحبہ جب دلال اور خریدار کو سامنے دیکھتی ہیں حالانکہ وہ سودا طے کر چکی تھیں پھر بھی ماں
غصہ کے سوچتی ہیں کہ

”وہ ٹھنڈی سانس بھر کر اٹھیں ایک بار جی چاہا اس کے منہ پر تھوک دیں حرام
زادے تیری بھی تو کنواری بیٹیاں ہیں۔ جان پر ایک نظر ڈال آ کیا یہ
روپیہ انہیں الماریوں میں سے نکال کر میری معصومہ کو خریدنے آیا ہے
جیسے وہ بھی آٹے کی بوری یا گھی کا کنستری۔“

بیگم صاحبہ جو عام ماؤں کی طرح بیٹی کی خیر خواہ تھیں جب بیٹی سودا کر چکیں تو ساری جھجک ساری
شرم یک لخت پرانے کپڑے کی طرح اتار کر پھینک دیتی ہیں اس وقت یہ دولت بٹور کر
عیش کرنے والی ایک تیز طرار مکار اور مطلب پرست عورت کے روپ میں نظر آنے لگتی
ہیں۔ وہ بار بار معصومہ عرف نیلوفر کو سمجھاتی ہیں کہ تم جس پیشہ میں ہو وہاں پر صرف دولت
اور جوانی کام آتی ہے اور کچھ نہیں۔ اس لئے جب تک یہ دونوں چیزیں دولت بٹور لو۔
”کتنا سمجھایا حرام زادی نیلوفر (معصومہ) کو کہ زیور لے یہ کوڑے کرکٹ میں پیسہ
مت غارت کر۔“

مگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا ایک ماں ایسا برتاؤ بیٹی سے کر سکتی ہے۔ وہ بھی صرف آرام کے لئے
یا پھر صرف اپنے چھوٹے بچوں کی پرورش کے لئے۔ یہ جرات اتنی آسان بات نہیں مگر بیگم
صاحبہ کے حالات کا بغور مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے اندر
بدلہ لینے کی زبردست خواہش تھی وہ چاہتی تھیں کہ جس طرح ان کے شوہر نے انہیں
اذیت پہنچائی ہے میں بھی انہیں ایسی تکلیف پہنچاؤں کہ ان کے بھی آنسو نہ تھیں۔ وہ بھی چیخ چیخ
کر روئیں اور کوئی ان کی فریاد نہ سنے۔ بیگم صاحبہ ان عام عورتوں میں سے نہیں تھیں جو شوہر کی دوسری
شادی کرنے پر صبر کر لیتی ہیں اور آنسو بہا کر خدائی مرنی سمجھ کر حالات سے سمجھوتہ کر لیتی ہیں۔
بیگم صاحبہ نے اپنے شوہر کو تکلیف پہنچانے کیلئے جو راستہ نکالا وہ بالکل انوکھا اور نرالا تھا۔

”— اس طرح انہوں نے اپنے شوہر سے بدلہ لے لیا۔ ادھر وہ کسی کی انیس برس کی گونپل کو کھول رہے تھے ادھر ان کی اسی عمر کی بیٹی کے دام لگ رہے تھے بڑے میاں کو خبر ملے گی کہ صاحب زادی نے دھندلا شروع کر لیا تو مزا آجائے گا۔“

سوداگی عصمت کا ایک مختصر سنا دل ہے اس ناول میں ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کی گئی ہے جسے بچپن میں دیوتاؤں کی طرح پالا گیا تھا اس کی آرتی اتاری جاتی سب اس کی عزت کرتے انہیں نیک فرشتہ سمجھا جاتا ایک رشتے کی موسیٰ نے انہیں پالا پوسا تھا ان کی خواہش تھی کہ بڑے سرکار کی شادی ان کی بیٹی اوشا سے ہو جائے۔ بڑے سرکار اپنے بھائی چند را در بہن تیمو سے بہت بڑے تھے اور اوشا انہیں پوجتی تھی ایک چاندنی ہی ایسی تھی جو نہ ان سے ڈرتی تھی نہ ان کی عزت کرتی۔ چاندنی کو چند رکھوڑے پر سے اٹھالایا تھا اس گھر میں اس کی پرورش ہوئی تھی اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا حالانکہ وہ لاوارث تھی پھر بھی وہ اپنے آپ کو کمزور نہیں سمجھتی وہ بڑے سرکار کے چہرے پر پڑا ہوا شرافت کا نقاب ہٹانا چاہتی ہے اور لوگوں کو ان کی اصلیت سے آگاہ کرنا چاہتی ہے ایک لاوارث لڑکی جس کا اس گھر کے سوا کوئی سہارا نہیں تھا پھر بھی وہ بڑے سرکار سے نہیں ڈرتی جب اسے شک ہو گیا کہ اسے غسل خانہ میں نہاتے وقت بڑے سرکار ہی جھانک کر دیکھتے ہیں انہیں رینگے ہاتھوں پکڑنے کے لئے وہ ایک ڈراما کھیلتی ہے۔

”— مگر اس نے طے کر لیا کہ وہ کسی طرح جھانکنے والے کو پکڑ لے گی۔ اس نے شیشے کا سوراخ بند نہیں کیا۔ غسل خانے میں جا کر اس نے یونہی پانی گرا کر اشراف کیا باغ کے دروازے کی کنڈی کھلی رکھی۔ اس کی نظریں شیشے پر جمی ہوئی تھیں۔ جھانکنے والے کو اندازہ نہیں تھا کہ اندر سے ہلکا سا سایہ دکھائی دیتا ہے جیسے ہی کھرچی ہوئی جگہ پر آنکھ آتی۔ چاندنی نے دھڑ سے دونوں پٹ کھول دیے۔ سامنے بڑے سرکار کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں میں زمانے بھر کی غلاظتیں یکجا تھیں۔“

ایک بے سہارا لاوارث لڑکی نے نہ صرف ان کی شکل پر پڑا ہوا شرافت کا نقاب ہٹایا

بلکہ ان کے پیار کو بھی ٹھکرا کر یہ ثابت کر دیا کہ عورت کا پیار پیسوں سے نہیں خریدا جاسکتا۔ اوشا نے اسے زہر کھا کر اس گھر کے قرض اتارنے کی بار بار رائے دی مگر وہ مرنے کو تیار نہ تھی اوشا نے اسے سورگ کے حسین خواب دکھائے دوسرے جنم کے آئندہ بھرے جیون کا بہلاوا دیا۔ بلیدان پر لکچر بھاڑے مگر وہ کسی بھی طرح بہلاوے میں نہ آئی۔ اور آخر کار بڑے سرکار کو اس کے آگے جھکنا پڑا وہ زہر کھا کر مر جاتے ہیں اور چند ر سے چاندنی کی شادی ہو جاتی ہے۔ ایک لاوارث لڑکی کی یہ جرأت قابل تعریف ہے۔

یوں تو عصمت چغتائی کے سبھی ناولوں میں عورت کا باغی روپ نظر آتا ہے وہ ہر اس چیز سے بغاوت کرتی ہے جسے وہ پسند نہیں کرتی۔ موجودہ سماج سے اس کے بوسیدہ رسم و رواج سے عورت کی موجودہ حالت کے خلاف مذہب کے خلاف وہ احتجاج کرتی نظر آتی ہے۔ اٹھارہویں سے بغاوت کرتی ایک لڑکی قدسیہ خالہ کے روپ میں نظر آتی ہے عصمت کے ناول "دل کی دنیا" میں۔

قدسیہ خالہ کی جب شادی ہوئی تھی تب وہ عام لڑکیوں کی طرح بہت خوش تھیں مگر شادی کے فوراً بعد ہی ان کے شوہر کو تعلیم کی غرض سے ولایت بھیج دیا گیا کیونکہ یہی تو شادی کی پہلی شرط تھی جب ان کے شوہر واپس آئے تو سب اچھے میں ایک میم بھی لے آئے۔ اور قدسیہ خالہ سہاگن ہوتے ہوئے بھی بیوہ کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئیں۔ شروع میں قدسیہ خالہ کا کردار نہایت سیدھا سادہ نکھایا بھولی اور معصوم سی نظر آتی ہیں۔ مگر ناول کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کے کردار میں بھی تیزی چالاکی اور جرأت عود کر آتے لگتی ہے۔ شروع میں قدسیہ خالہ کی جسمانی خواہش پوری نہیں ہو پاتی اس لئے وہ بے چین، پریشان اور اداس سی رہتی ہیں۔ گھر والے اس کیفیت کی وجہ سمجھ نہیں پاتے اور اس کا علاج جلاب پلا کر گنڈے تعویذ اور نماز روزے کا بہلاوا دیکر کرنا چاہتے ہیں مگر قدسیہ خالہ کو اپنی بیماری کا علاج رشتے کے ایک دیور بشیر حسن میں نظر آتا ہے اور وہ ان کی طرف جھلکتی چلی جاتی ہیں حالانکہ ان کی شخصیت ایسی نہیں تھی کہ کوئی محبت کرتا مگر قدسیہ خالہ محبت کے باوجود گھر والوں کے ڈر سے بات تک نہیں کرتی تھیں والدین کی مرضی سے ہر کام انجام دیتی تھیں۔

”اے بیٹی قدسیہ ذرا سادو دھپی لو“

” اچھا بی اماں “
 ” بیٹی اب لیٹ جاؤ گب سے کھوٹا سی بیٹھی ہو ایسے کب تک پڑی رہو گی۔
 اب اٹھ بیٹھو۔ “

مگر اس بے زبان قدسیہ خالہ نے چند برسوں بعد ہی یہ جان لیا کہ دبی سہمی قدسیہ زندگی کی کوئی خوشی حاصل نہ کر سکے گی کیونکہ یہ بے رحم دنیا ان لوگوں کو اور بھی دباتی ہے جو تھوڑا سا بھی دتے ہیں۔
 قدسیہ خالہ نے اس حقیقت کو بھی جان لیا کہ دوسروں کے بنائے راستے پر چلنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے کیوں کہ ہر انسان کے ساتھ ایک نئی طرح کی پریشانی آتی ہے اور اس نئی پریشانی کے حل کیلئے نیا راستہ ایجاد کرنا بھی ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی دوسروں سے حق و انصاف کی امید رکھنا بھی بے کار اور فضول ہے اس سماج سے خوشی کی امید رکھنا ویسا ہی ہے جیسے ٹوٹے گھرے میں پانی جمع کرنے کی امید۔

ان سب حقیقتوں سے آشنا ہونے کے بعد قدسیہ بیگم میں تبدیلی آئی شروع ہو گئی تھی پہلے وہ بشیر حسن سے سامنا ہونے پر گھبرا جاتی تھیں اب کھلے طور پر سب کے سامنے ملتیں باتیں کرتیں کتابیں لیتیں اور باتیں کرتی نظر آتیں۔ پہلے یہ میلا کپڑا پہنے بستر پر آنکھ بند کئے پڑی رہتیں نہ کسی سے باتیں کرتیں نہ ہنستیں مسکراتیں۔ دنیا سے بیزار۔ زندگی کو ایک سزا کی طرح گزارتی تھیں۔ اور بات بات پر اپنے اوپر مہرگی کے دورے ڈال لیتیں۔ شوہر کے نام پر دقت بے دقت رویا کرتیں مگر جب سے انہوں نے بشیر حسن سے ملنا شروع کیا تھا ان کے اندر غیر معمولی تبدیلی آئی شروع ہو گئی تھی۔ اب انہوں نے اپنے نام اور شوہر کے نام پر ردنا دھونا اور خود اپنے آپ پر ترس کھانا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ طرح طرح سے تنگ سالہ کو کوٹ کراٹن بنا کر ملتیں بالوں کو سوارتیں خوبصورت اور نفیس کپڑے پہنتیں بھر بھر ہاتھ چوڑیاں پہنتیں۔ پھولوں کی بالیاں پہن کر میرا کے بھیج گایا کرتیں۔ ”میرے تو گر دھر کو پال دوسرا نہ کوئی“۔ قدسیہ کے بدلتے یہ تیور دیکھ کر جب گھر والے انہیں ٹوکتے یا اعتراض کرتے تو وہ ایسا مسکرا کر تیوری چڑھاتیں کہ سب ڈر جاتے۔ جب یہ نہی خود میر قدسیہ خالہ کسی کے بس میں نہ آتیں اور من مانی کرنے لگیں تو گھر والوں نے طے کیا کہ انہیں سسرال بھیج دیا جائے سسرال کا نام سنتے ہی قدسیہ بیگم الگ بگولہ ہو جاتی ہیں اور اب تک کی دبی نفرت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے

اور وہ اپنے سسرال والوں پر ٹوٹ ہی پڑتی ہیں۔
 ”بیٹے کو کچھ نہیں کہتا مگر کہیں کا۔ آگ لگے اس کی داڑھی میں۔۔۔۔۔
 ۔۔۔۔۔ ارے بد بخت تیرا ماموں ہے، نانی بیوی چلائیں۔
 تھو ہے ایسے ماموں پر جنم میں پھوٹے منہ سے اپنے بیٹے سے نہ کہا گیا
 کچھ؟ ارے وہ تو بڑے خوش ہیں میم آئی ہے تو لالو چپو کرتے ہیں چھری
 کانٹے سے میز کرسی پر ڈنر کھاتے ہیں بیٹے کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں نا۔ اچھلے
 میم کے سامنے کتے کی طرح دم ہلاتے ہیں۔ بس وہ میم ہی تو انہیں بخشولے گی!
 اسی کا سایہ پکڑ کر جنت ملے گی۔“

قدسیہ کی زبان درازی سے والدہ چونک پڑیں کہاں وہ قدسیہ کے اٹھنے بیٹھنے میں بھی ماں
 کا حکم مانتی تھیں اور کہاں اب سسرال والوں کو گالیاں دے رہی ہیں۔ والدہ نے مارے
 غصہ کے جوتی اٹھالی قدسیہ کو مارنے کیلئے یہ دیکھنا تھا کہ مارے غصہ کے قدسیہ نے والدہ
 کا ہاتھ پکڑ کر اینٹھ دیا جب گھر والوں نے دیکھا کہ قدسیہ بیگم والدہ کو مار رہی ہیں تو لوگ بائے تو بہ
 بچا کر بھاگے قریب تھا کہ قدسیہ کی جرات پر سب ٹوٹ پڑتے مگر مرگھٹ کی بھتنی چوٹ کھائی
 ناگن اور زخمی شیرنی کی طرح قدسیہ بیگم گر جیں۔

”خبردار جو کسی نے مجھے ہاتھ بھی لگایا۔ قرآن پاک کی قسم سر بھاڑ دوں گی!
 قدسیہ خالہ نے سل کا بٹہ سر سے اوچھا اٹھایا۔ سب کو اپنی جان پیاری تھی۔
 آگے بڑھنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔“

جس طرح انڈے میں سے بچہ نکلتا ہے اور اس کی اپنی الگ شخصیت ہوتی ہے اسی طرح
 معلوم ہوتا تھا کہ قدسیہ خالہ بھی اپنا چولا بدل چکی ہیں۔ جہاں پرانی قدسیہ کی جھلک نہ رہی تھی جب
 قدسیہ بیگم کی تبدیلی اور تیزی پر گھر والوں کا بس نہ چلا تو سب نے کہنا شروع کیا کہ قدسیہ
 بیگم کے سر پر کوئی آتا ہے۔ اور اس خبر کا عالم ہونا تھا کہ یکایک قدسیہ بیگم کا عہدہ بڑھ گیا۔ سبھی
 لوگ ان سے ڈرنے لگے اور ہر طرف سے محبت کا طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اب کوئی کچھ
 نہ کہتا۔ مگر قدسیہ بیگم کو سکون تو ابھی بھی نہیں ملا تھا صحیح راستہ کی جستجو تو ابھی بھی باقی تھی۔
 اب انہوں نے شوہر کے نام پر کڑھ کڑھ کر زندگی گزارنا مناسب نہ سمجھا اور ایک روز نئی

راہ پر چل پڑیں اسی بشیر حسن کے ساتھ۔

ایک روز جب پورا گھر خواب غفلت میں مدھوش تھا قدیہ خالہ نے گھر کو چھوڑ دیا اس گھر کو جہاں ان کی خوشی چھینی جاتی تھی جہاں اچھے کپڑے اور زیور پہننے پر روکا جاتا تھا جہاں صرف ان کی محرومیوں پر ترس کھایا جاتا تھا ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاتا تھا۔
قدیسہ بیگم کا گرداران ہزاروں لاکھوں دینی سہمی لڑکیوں کا نمائندہ نظر آتا جن کے ساتھ بالکل قدیسہ بیگم جیسے حادثات گزرتے ہیں بس ضرورت ہے تو قدیسہ بیگم ہمت کی جس روز عورت خود اپنے لئے فیصلہ کرنا سیکھ جائے گی اسی روز وہ مضبوط بھی ہو جائے گی اور اپنی کھوئی خوشی بھی حاصل کر لے گی۔

۵ "باندی" عصمت کا نہایت مختصر سنا دل ہے اس ناول کا موضوع نوابین اور ان عیاشیاں ہیں۔ اسلام میں نکاح کے بغیر کسی عورت یا مرد سے تعلق بنائے رکھنا بدکاری سمجھا جاتا ہے مگر نوابین اپنے فائدہ کے لئے اپنے عیش و آرام کے لئے مذہب کے قاعدے قانون کو بد ڈالتے ہیں۔ جاگیردارانہ سماج میں باندیاں رکھنے کا رواج عام تھا یہ باندیاں خریدی بھی جاتی تھیں اور پالی بھی جاتی تھیں جہاں ایک طرف یہ گھر کا کام کاج کرتیں وہیں دوسری طرف نوابین کے بستر بھی گرم کرتیں اس غلامی کے باوجود باندیوں کی کوئی عزت نہ تھی اور ان کی اولادیں غلاموں کی سی زندگی بسر کرتی تھیں۔ جائداد میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوتا تھا۔ باندیوں سے تعلق رکھنا فخر سمجھا جاتا تھا اور ایک نواب کسی گنتی باندیوں سے تعلق رکھتے تھے ایسے میں بیویوں پر کیا کچھ گزرتی ہوگی اس کا ذکر اس ناول میں بخوبی ملتا ہے۔ آج تک عورتیں اپنے شوہروں کے ظلم و ستم کچھ سنسی خوشی برداشت کیا کرتی ہیں یہ انسانی فطرت ہے کہ جب ہم چاہتے ہیں اس کا ہزارہ پسند نہیں کرتے مگر نوابین کی بیویوں کو یہ بھی برداشت کرنا پڑتا کہ ان کا شوہر کئی باندیوں کے ساتھ عیاشی کرتا ہے۔ اس ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کرتی ہے حرمہ جو یہ جاننا چاہتی ہے کہ لڑکیوں کو بھی نواب زادوں کی طرح عیاشی کرنے کا حق ہے یا نہیں۔ کیا وہ بھی کئی لڑکوں سے تعلق بنا سکتی ہے یا نہیں؟ وہ پوچھتی ہے کہ

"اے بیٹیا آپ بھی غضب کرتی ہیں۔ نواب ایسے ہیں بونڈی باندی سے تو جی کا پہلا واہوتا ہے۔ موتی سے شادی کیا نہیں کرتا۔" ہوں، تو

نواب زادے شادی کلمہ سے کرتے ہیں۔ ہم نواب زادیوں سے.....“
 اور کیا بیٹا۔ ”بوا کی بوٹھلاہٹ بڑھتی ہی جا رہی تھی ایک بات
 پوچھوں سچ سچ بتاؤ گی۔ حرمہ قریب کھسک کر بیٹھ گئی۔ پوچھئے شوٹ سے۔
 بڑی مری ہوئی آواز گلے سے نکلی نواب زادوں کی بانڈیاں ہوتی ہیں تمہیں جبار
 کی قسم سچ بتانا۔

نواب زادیوں کے بھی.....“

”ہے سے بیٹا۔“ بوا نے اپنا منہ پیٹ لیا۔ ذرا شرم کیجئے یہ سوال کل بھی تھا اور آج بھی
 باقی ہے کہ عورت کو کئی کئی مزدوں سے تعلق بنانے کا رواج کیوں نہیں ہے اسے اجازت کیوں نہیں
 ہے اور اگر ایسا ہوتا بھی ہے تو اسے معیوب کیوں سمجھا جاتا ہے۔ یہ سوال کل نجاگیر دارانہ نظام
 میں بھی تھا اور آج ترقی پسند معاشرے میں بھی باقی ہے۔ مگر جرات ہے حرمہ کی کہ وہ یہ بات
 پوچھ لیتی ہے ورنہ پہلے لڑکیاں سوال تک نہیں کر سکتی تھیں وہ صرف برداشت کرتی تھیں
 سہتی تھیں مگر اس کے خلاف آواز بلند نہیں کر سکتی تھیں۔

اسی طرح اس نادل میں گوری بی بی کا ایک مختصر سا کردار ہے جس کی زندگی ایک نواب نے
 خراب کی۔ جس کا بچہ چادل کی بی بی کر بڑا ہوا اور نواب زادی کے بچے نے گوری بی بی کا دودھ
 پیا۔ حالانکہ اس زمانے میں عام رواج تھا کہ بانڈیاں اپنا دودھ نواب زادوں کو پلاتی تھیں۔
 اور اگر ایسا نہ ہوتا تو باہر سے ایسی عورتیں بلائیں جاتیں تھیں مگر گوری بی بی اس بات کو برداشت
 نہیں کر پائی اور جب اسے ایسا کرنا ہی پڑا۔ تو اس کے اندر بغاوت کا جذبہ بدلہ لینے کا
 جلا بہ پیدا ہوتا ہے وہ سوچتی ہے کہ

”میرے کلیجے میں تو اس روز ٹھنڈک پڑے گی جب یہ کسی نواب زادی
 کا پیٹ پھلائے گا۔“

ایک بانڈی کی یہ خواہش کہ جس طرح اس کی زندگی خراب ہوئی ہے کاش نواب زادی
 کی بھی ہو۔ اس کے اندر پیدا ہونے والے شدید ترین رد عمل کو ظاہر کرتی ہے۔

عصمت کا سب سے پہلا ناولٹ ”ہندی“ ایک رومانی المیہ ہے پورن نام کے ایک
 فہمی ہنس مکھ لڑکے کے ارد گرد یہ ناولٹ کھومتا نظر آتا ہے۔ بچپن سے ہی اسے اپنے گھر کی نوکری

اُدنا سے محبت ہو گئی تھی مگر گھر والے اس کی شادی شانتا نام کی لڑکی سے کر دیتے ہیں۔ شادی کے بعد پورن نے شوہر کا حق ادا نہ کیا وہ ہر وقت اوشا کی یاد میں کھو یا رہتا ہے اور بیمار پڑا رہتا شانتا نے نشر دے میں پورن کا دل جیتنے کیلئے دل و جان سے اس کی خدمت کی اس کی دلجوئی کی۔ مگر کسی طرح وہ پورن کا دل نہ موہ سکی اور تب اس نے اپنے رشتے کے دیور سے دوستی کر لی وہ کھلے طور پر پورن کے سامنے اس سے (مہیش) اظہار عشق کرتی۔ مگر وہ اندر سے بیچین ہے اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس طرح زندگی بسر کرے گی۔ کیونکہ جس کا شوہر ہی اپنا نہ ہو اس کا شوہر کے گھر سے کیا تعلق۔ اوشا کے سامنے بھی دو راستے تھے یا تو وہ زندگی بھر سسرال میں بغیر اپنے شوہر کے زندگی گزار دیتی تب اسے زندگی کی خوشیاں نہ مل پاتیں۔ مگر دوسری طرف ہمیش کی محبت تھی جہاں رسوائی اور بے عزتی تو تھی مگر دل کا سکون اور سچی خوشی بھی تھی وہ خود بار بار اس بارے میں سوچتی ہے۔

”— شانتا کے سامنے بھی دو ہی راستے تھے ایک تو وہی جس پر وہ چل

رہی تھی یعنی پتی ورنہ ہندوستانی بیوی بن کر جگ کی لاڈلی ہینک اور پار سا جہاں وہ مٹی کے ڈھیلے کی طرح لڑھک رہی تھی۔ اس سے بھی بدتر مٹی کے ڈھیلے سے کبھی کوئی گھاس بھوس کا تہکا تو آگ آتا ہے وہ بھی کبھی کسی مصرف میں آجاتا ہے مگر وہ تو اور ہی کچھ تھی۔ اس ٹھنڈی چٹا میں سال سے اوپر سے جھلستے ہو گیا۔“

مگر شانتا چونکہ عصمت کے ناول کا کردار تھی اس لئے وہ بندھے ٹکے سیدھے راستہ پر چلنا پسند نہیں کرتی وہ جگ کی لاڈلی بننے سے اچھا سمجھتی ہے کہ خوش رہے اور شاید اسی لئے وہ ایک جرأت آزمایا قدم اٹھاتی ہے ایک روز وہ اس گھر کو جہاں وہ بہو اور بیوی بن کر آئی تھی جہاں سے اس کی اچھی نکلنی تھی تھلا بجلی دیتی ہے شانتا نے پورن کو ایک خط لکھا۔

”میں جا رہی ہوں۔ میں آپ کی کوئی بھی نہیں —

پھر بھی — شانتا —“

شانتا نے وہ کام کیا جسے کرتے ہوئے بڑے بڑے پھراتے ہیں وہ اس گھر کو سدا سدا کے لئے چھوڑ گئی جہاں نہ اس کا سہاگ تھا اور نہ کوئی اپنا۔ شانتا نے دور کی لڑکی تھی اسے زندگی کی خوشیاں عزیز نہیں اس نے ہزاروں لاکھوں سال سے چلی آرہی پر میرا کو توڑ کر چکنا چور کر دیا

کہ شوہر کا گھر ہی عورت کا اصلی گھر ہوتا ہے اور سسرال سے ارتھ ہی نکلتی ہے کیونکہ وہ اس
 نقیقت کو جانتی تھی کہ زندگی بغیر کسی سہارے کے نہیں گزر سکتی۔ جس طرح بغیر سہارے کے
 بیل پھل پھول نہیں سکتی اور اگر کھلتی بھی ہے تو بے ترتیبی سے جہاں اس کی خوبصورتی اس کی
 وقعت سٹی میں مل جاتی ہے۔

گھر سے لڑکی یا بہو کا بھاگنا کسی بھی معنی میں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ
 عصمت کی ہیروئن نہ صرف بدتمیزی کرتی ہے، نا انصافی کے خلاف آواز اٹھاتی ہے بلکہ مارتی
 پٹتی بھی ہے۔ بغاوت کرتی ہے لڑتی ہے اور گھر سے اکثر و بیشتر بھاگ بھی جاتی ہے مگر پھر بھی
 بری معلوم نہیں ہوتی بلکہ قاری کو اس کردار سے ہمدردی ہوتی ہے وہ اس کے بھاگنے بدتمیزی
 نے اور بغاوت کرنے کو اچھا سمجھتا ہے کیونکہ وہ خود کو کردار کے غم میں اپنے آپ کو شریک
 پاتا ہے اور ایک اچھے کردار کی پہچان بھی یہی ہے۔

عصمت کی ہیروئن کا ذکر چل رہا ہو اور شمن کا بیان نہ کیا جائے تو عصمت کے اس
 کردار کے ساتھ نا انصافی ہوگی۔ ”ٹیڑھی لکیر“ عصمت کا شاہکار سمجھا جاتا ہے یہ بھی کرداری
 ناول ہے اس کی ہیروئن شمن کے ارد گرد اس ناول کی کہانی گھومتی نظر آتی ہے۔ عصمت کے
 کرداروں میں واحد یہ کردار ایسا ہے جس نے بچپن سے ہی بغاوت سیکھ لی تھی ورنہ ان کے
 کردار ماحول سے اتنا کر بغاوت کرتے ہیں مگر شمن بچپن سے ہی ضدی تھی اس
 نے ہر اس بات پر بغاوت کی جسے وہ پسند نہیں کرتی تھی اس نے
 ہاسٹل میں رہ کر تعلیم مکمل کی، نوکری کی، شادی سے بغاوت کی اور اپنے پسند کے لڑکے سے
 شادی کی مگر جب نباہ نہیں پائی تو لڑائی کی اور اس قدر لڑائی ہوئی کہ اسکا شوہر گھر چھوڑ کر بھاگ
 گیا۔ اس طرح یہ مکمل باغی کردار ہے۔

عصمت کی ہیروئن نے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ کیونکہ ان کی ہیروئن قرۃ العین حیدر
 کی ہیروئن کی طرح دقت کا رونا نہیں روتی۔ وہ دقت کے شکنجے میں رہ کر برباد نہیں ہوتی۔ اور
 نہ ہی گمشدہ کی ہیروئن کی طرح محبت اور وفاداری میں اپنے آپ کو مٹا دیتی ہے وہ
 پریم چند کی ہیروئن کی طرح ڈری ڈری سہمی سہمی بھی نظر نہیں آتی ہے وہ کام بھی کرتی ہے بغاوت
 بھی کرتی ہے تو اپنے آپ کو گھر والوں کو سماج سے الگ نہیں کرتی بلکہ یہ خود بڑی جرات اور

ہمت سے آگے بڑھتی ہے اور دقت کے ساتھ چلنا پسند کرتی ہے۔ عصمت کی ہیروئن رونے دھونے میں یقین نہیں کرتی وہ بغاوت کرتی ہے آواز بلند کرتی ہے چیخ پچیخ کرنا انسانی کا اعلان کرتی ہے یہ لڑتی ہے جھگڑتی ہے اور جب کامیاب نہیں ہوتی تو جھنجھلاتی بھی ہے کیونکہ یہی تو ہم اور آپ سمجھی کرتے ہیں۔

جو جرات جو ہمت عصمت کے ناولوں میں نظر آتی ہے کہیں اور نظر نہیں آتی۔ ہاں بیدی کے ناولٹ "ایک چادر میلی سی" میں راتو ہے جو لڑتی ہے جھگڑتی ہے رونی ہے اور آخر کار جو چاہتی ہے کر کے دکھا دیتی ہے۔

آکاش دانی کی اردو سروس نئی دہلی سے نشر اور ماہنامہ 'نیا دور' لکھنؤ جولائی ۱۹۹۰ء میں شائع۔

عصمت کے ناولوں کا بندرج ارتقا

عصمت چغتائی نے اپنے ادبی سفر میں نہ صرف مختصر افسانوں کے ذریعے ہنگامہ برپا کیا بلکہ بعض اہم ناول بھی لکھے ہیں جو اپنی گونا گوں خصوصیات کے باعث ناول نگاری کے میدان میں کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان ناولوں کی بنیاد پر انہیں اردو ناول نگاری کی تاریخ میں اہم مقام حاصل ہے۔ مختصر افسانوں کی طرح انہوں نے ناول نگاری کے میدان میں بھی اپنے پیش رو قلم کاروں کی پیروی کرنے یا ان کے نقش قدم پر چلنے کے بجائے اپنی راہ الگ بنانے کی کامیاب سعی کی اور اردو ناول کو نئے طرز اسلوب نئے موضوعات اور نئے تجربات سے مالا مال کیا۔ ڈاکٹر بارون ایوب کے مطابق

”عصمت چغتائی ترقی پسند مصنفین میں اس حیثیت سے انفرادیت کی حامل ہیں کہ انہوں نے مسلم متوسط گھرانوں کی پردہ نشین لڑکیوں کی نفسیاتی الجھنوں اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ دراصل اس طرح وہ مسلم معاشرہ میں پھیلی ہوئی برائیوں کو بے نقاب کرنا چاہتی ہیں۔“

عصمت کے تقریباً سبھی ناولوں کا موضوع گھریلو زندگی ہے۔ یعنی ان کے کامیاب ناول گھریلو فضا کو پیش کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ عصمت نے گھر کے اندر چھپے ہوئے ان رازوں کو فاش کیا ہے۔ جن کے بارے میں لوگوں کو زیادہ معلومات نہیں تھیں انہوں نے ہندوستانی عورت کو سچائی کے ساتھ عورت ہی کے روپ میں سماج کے سامنے لا کر دکھایا۔ عصمت نے صرف مظلوم بے کس لاڈلاری اور روتی دھوتی عورت کو پیش

کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی محرومی کی وجوہات بھی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ عصمت نے گھر کے اندر کے بوسیدہ رستے ہوئے ناسوراور پکتے پچھتاتے ہوئے زخم کو سماج کے سامنے کھول کر رکھ دیا اور اس کے علاج کی طرف توجہ دلائی ہے۔

عصمت کے ناول بظاہر رومانی محسوس ہوتے ہیں لیکن درحقیقت وہ نفسیاتی حقائق کو پیش کرتے ہیں، علی عباس حسینی کا خیال ہے۔

”ناول کی صرف دو قسمیں ہونا چاہیئے ایک تو رومانی دوسرے نفسیاتی۔ رومانی ناول تو وہ ہیں جن میں پلاٹ پر زور دیا گیا ہو اور کوئی اخلاقی، عمل، اسرار، تاریخی واقعہ بیان کیا گیا ہو جس میں حسن و عشق کی کشمکش اور بہادری، جنگ جوئی سیاست وغیرہ کی تقویریں پیش کی گئی ہوں ان سب کے رومان کے نام سے مُلقب کیا جائے گا۔ نفسیاتی ناول وہ ہوگا جس میں معاشرت سیرت کردار سے بحث کی گئی ہو اور جس میں تحلیل و تجزیہ نفس سے کام لیا گیا ہو۔“

عصمت کے ناول اپنی آخری پہچان میں نفسیاتی ہی ہوتے ہیں عشق کی چاشنی کے باوجود رومانی نہیں ہوتے حالانکہ ان کا پہلا ناول ”ضدّی“ جو ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول شروع سے آخر تک رومانی ہے اور اس ناول میں کوئی نئی بات بھی نہیں ہے۔ انسانی جذبات اور ماحول سے متاثر انسانی نفسیات سے عصمت چغتائی کے گہرے لگاؤ کا اندازہ اس ناول سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔

’ضدّی‘ عصمت چغتائی کا پہلا ناول ہے حالانکہ یہ ایک ترکی ناول کا چہرہ ہے اور اس کی کہانی دیو داس قسم کا رومانی المیہ ہے۔ اس کا ہیرو یورن ہے جس کے ارد گرد یورانا ناول گھومتا ہے یہ ایک ہنس مکھ اور ذہین لڑکا ہے والدین کے آنکھوں کا تارا بھاتی بھاتی کاچھتیا ہر وقت ہنسی مذاق کرتا رہتا ہے اوزبکوں کے ساتھ کھیلنا بوڑھی بوا سے اکثر چھیڑ چھاڑ کرتا ہے۔ اسی دوران اپنے گھر کی آباکی نواسی آشنا سے اس کی دوستی ہو جاتی

ہے۔ یہ دوستی کب محبت تک پہنچ گئی کسی کو خبر نہ ہوئی پورن کے والدین چونکہ اس شادی کو مناسب نہیں سمجھتے اس لئے آشا کو گاؤں بھیج دیا جاتا ہے اور پورن سے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ آشا بیماری میں مر گئی۔ اتفاق سے پورن کی برات جس گاؤں میں جاتی ہے وہاں آشا کی ایک جھلک دکھ کر وہ دیوانہ سا ہو جاتا ہے۔ اور آشا سے ہی شادی کرنے کی ہند کرتا ہے مگر والدین اسے یہ بتاتے ہیں کہ وہ آشا نہیں بلکہ اس کا وہم تھا۔

شادی کے بعد بھی پورن آشا کو ہی چاہتا ہے اور اس کے لئے بے چین رہتا ہے اپنی بیوی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا ہے اس کی بے رخی سے عاجز اگر پورن کی بیوی مہیش نام کے ایک لڑکے سے کھلم کھلا عشق کرنے لگتی ہے مگر یہ سب دیکھ کر بھی پورن کو برا نہیں لگتا بلکہ وہ اس کی اس حرکت کو اچھا مانتا ہے۔ دن بون پورن کی طبیعت خراب ہوتی جاتی ہے وہ لاغر سامریض بن کر رہ جاتا ہے اس کی حالت پر ترس کھا کر والدین آشا کو بلاتے ہیں لیکن جب (غیر) تک آشا آئے پورن کی موت ہو جاتی ہے۔ آشا بھی پورن کی موت کو برداشت نہیں کر پاتی اور آگ لگا کر خود بھی ستی ہو جاتی ہے۔

مجموعی طور پر یہ ناول رومانی المیہ ہے اس میں کوئی خاص بات بیان نہیں کی گئی ہے پورن کا کردار صرف تخیل کی دنیا تک بلند ہے عملی طور پر نہایت ہی کمزور ثابت ہوتا ہے آشا بھی ایک عام سی لڑکی ہے اس ناول میں اگر کوئی قابل تعریف کردار ہے تو وہ پورن کی بیوی شانتا کا ہے جس میں ارتقا ملتا ہے۔

”معصومہ“ ناول ۱۹۶۱ء میں لکھا گیا۔ یہ ایک معصوم لڑکی کی بربادی کی کہانی ہے جو ^{معصومہ} بچپن میں اپنے گھر والوں بھائی بہنوں اور والدین کی بہت دلاوری تھی اور آخر میں اپنے گھر والوں کی بہتری کے لئے ایک طوائف بن جاتی ہے۔ یہ کہانی تقسیم ہند کے دوران کی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ معصومہ کے والد اپنے خاندان کو ہندوستان میں چھوڑ کر پاکستان چلے جاتے ہیں کہ وہاں نوکری حاصل کر لینے کے بعد گھر کے باقی افراد کو بھی وہیں بلا لیں گے لیکن معصومہ کے والد نے پاکستان جا کر ایک نو عمر لڑکی سے شادی کر لی اور گھر والوں کو پاکستان نہ بلایا۔ ادھر یہ خاندان کچھ برس حیدرآباد میں رہنے کے بعد بمبئی آ جاتا ہے۔ یہاں مغربی میں دن کٹتے رہے کہ پہلے زیورات بکے اب نوبت گھر کے سامان بیچنے کی آگئی تھی تبھی ان لوگوں کی ملاقات احسان صاحب

سے ہوتی ہے ان کی نظر معصومہ کی جوانی پر پڑتی ہے اس کی خوبصورتی کی وجہ سے احسان صاحب اسے فلم کی ہیروئن بنانا چاہتے تھے۔ جب معصومہ کے گھر میں فاتحے ہونے لگتے ہیں تو اس نازک موقع پر احسان صاحب ان لوگوں کی مدد کرتے ہیں اور معصومہ اور انکی والدہ کی ملاقات ”احمد بھائی“ سے کر دیتے ہیں جو عیاش قسم کا آدمی ہے اور کئی عورتوں سے تعلق رکھتا ہے اس کی نیت خراب ہے وہ معصومہ کی وجہ سے اس کے گھر والوں کی مدد کرتا ہے ایک روز معصومہ کی ماں احمد بھائی کا منشا جان لیتی ہے مگر کچھ کہہ نہیں پاتی کیونکہ انہیں اپنی اور لڑکیوں کی پرورش کرنی تھی ان کا لڑکا ابھی چھوڑا تھا۔ احسان صاحب شہرت کے بھوکے تھے وہ احمد بھائی جو ایک مالدار شخص کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر فلم بنانا چاہتے تھے جس کی ہیروئن وہ معصومہ کو بنانے کے خواہش مند تھے۔ اس طرح معصومہ احمد بھائی، احسان صاحب راجہ صاحب اور ان کے جیسے کئی لوگوں کی وجہ سے طوائف بن جاتی ہے مگر اسکی نسوانیت پھر بھی ختم نہیں ہوتی۔

اس ناول میں عصمت نے سماجی طبقاتی شعور کے ساتھ گناہ میں جکڑی ہوئی لڑکی کی کرب ناک داستان پیش کی ہے نوابین کے خاتمے کے بعد اس خاندان پر کیا گزری یہ اس ناول کا موضوع ہے، یہ کہانی اس زمانے کے لٹے پٹے مفلس اور بے کس خاندان کی کہانی ہے۔ اس ناول میں عصمت انسانی نفسیات کی بہت سی خرابیوں کو بھوک سے تعبیر کرتی ہیں جنس کی بھوک، روٹی کی بھوک، شہرت کی بھوک عزت اور دولت کی بھوک وغیرہ۔ اس کائنات کی اچھائی اور برائی اس بھوک سے وابستہ ہے۔ ہر عورت کا زیور عزت، کہنے والی ماں نے اپنی اور بچوں کی بھوک کی خاطر اپنی بیٹی کو ایک بڑھے شخص کے ہاتھ چھوڑ دیے کی خاطر فروخت کر دیا تھا تاکہ وہ اپنی زمین بچا سکے، ایک گائے خرید سکے۔ ؟

معصومہ میں ایک ماں اپنی بیٹی کو اپنی اور اپنے خاندان کی پرورش کے لئے بیچ دیتی ہے تاکہ گھر کی بھوئی ٹشان قائم رہ سکے، ان کے بچے اسکولوں میں اچھی تعلیم حاصل کر سکیں وہ معصومہ سے کہتی ہیں

”تجھے قربانی دینی ہوگی بھوٹے بہن بھائیوں کی ناؤ پار لگانے کیلئے تیار بننا ہوگا“

اس ماں نے خود اپنی پاک دامن معصوم بھولی سی لڑکی کو طوائف بننے پر مجبور کر دیا۔ گویا عورت اگر نہ سچی نہ جائے وہ اپنے جسم کا استعمال نہ کرے تو گھر کا خرچ نہیں چلا سکتی۔
 اس ناول کی زبان بمبئی کی زبان ہے اور فلمی ماحول کی عصمت چغتائی نے بڑی کامیاب عکاسی کی ہے۔ کہانی پڑھنے کے بعد جہاں سماج سے نفرت ہوتی ہے وہیں معصومہ سے ہمدردی بھی ہوتی ہے۔ عصمت نے زیادہ تر ناولوں میں سماج کو "ولین" بنا کر پیش کیا ہے۔

معصومہ کا کردار اس ناول میں پلاٹ اور کہانی یا پھر موضوع سب سے اہم ہے یہ ایک مسلم متوسط خاندان کی لڑکی ہے تین بھائیوں کے بعد اس کی پیدائش گھر میں خوشی کا ماحول بنا دیتی ہے۔ اس کے گھر والے مذہبی ہیں۔ اور اس کا نام بھی قرآن شریف دیکھ کر رکھا گیا تھا۔ مذہبی تعلیم اسے بچپن سے دی گئی۔ انیس اربیس برس تک اس کی زندگی بڑے سکون کے ساتھ اخلاقی مذہبی اور علمی ماحول کے زیر اثر گزری اس کے ادبی ذوق کا بیان عصمت یوں کرتی ہیں "اسے شیلے سے عشق تھا اور کیٹس پر دم جاتا تھا۔ بارن کے نام پر دل دھڑکنے لگتا تھا۔" لے

ان شاعروں کے پسند کرنے کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ذہین اور جذباتی لڑکی تھی۔ اس کا ذہن بہت جلد ہر نئی چیز کی طرف مائل ہو جاتا تھا، وہ "ولایت" جا کر تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی تاکہ اس کے علمی ذوق کو تسکین حاصل ہو۔ مگر حیدر آباد سے بمبئی آنے کے بعد اس کے خواب پکنا چور ہو جاتے ہیں کیونکہ خود اس کی ماں نے دلال بن کر اسے اپنے عیش و آرام کے لئے طوائف بننے پر مجبور کیا ایک خاص بات جو ہم نے عصمت کی ناولوں میں محسوس کی ہے کہ عصمت کے ناولوں میں عام طور سے ماں کا کردار یا تو ہوتا ہی نہیں اور اگر ہوتا ہے تو نہایت غیر ذمے دار ماں کا کردار اُبھرتا ہے۔ یہاں بھی معصومہ صرف اپنی ماں کی وجہ سے بربادی کے راستوں پر چلنے کے لئے مجبور ہوتی۔

ایک معصوم لڑکی جو کہیں بھی نوکری کر سکتی تھی پڑھی لکھی سمجھ دار تھی ماں نے اسے ایسی

راہ دکھائی جو بری ہے جہاں صرف بدنامی اور ذلت ہے۔ احمد بھائی اور اس کی ماں نے معصومہ کو طوائف تو بنادیا مگر وہ بازار حسن میں پہنچ کر بھی بالکل بازاری نہ بن پائی۔ معصومہ کو اپنے چھوٹے بھائی بہن کی تعلیم کا ہمیشہ خیال رہتا اور وہ بار بار تعلیم کے فائدہ کی طرف اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو راغب کرتی ہے۔ خود بھی اس دلال سے نکلنا چاہتی ہے مگر اہل خاندان کا خیال کر کے نکل نہیں پاتی۔ وہ اپنے آپ کو مٹا کر بھی اپنے خاندان والوں کو خوش دیکھنے کی خواہش مند نظر آتی ہے۔

معصومہ اپنی بہن کی شادی میں سورج مل۔ احمد بھائی اور سبھی کو بلاتی ہے اور اس طرح زندگی سے سمجھوتہ کرنے والا ایک کردار بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس کے کردار میں ارتقاء ملتا ہے۔

عصمت نے اس کردار (معصومہ) کے ذریعہ سماج کے نام نہاد مکر وہ چہرے سے نقاب اٹھانے کی کوشش کی ہے اور کامیاب بھی ہوئی ہیں۔ احمد بھائی بھکاری اور چاچا پوسی سورج مل کا کالا بازاری راجہ صاحب کی سماج سیواسب کی ایک ایک پرت اتار کر عصمت نے انہیں بے نقاب کیا ہے۔ مجموعی طور پر عصمت چغتائی کا یہ ناول ان کے پہلے ناول کے مقابلے میں کہیں زیادہ کامیاب قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس میں جہاں فکری لحاظ سے گہرائی نظر آتی ہے وہیں فنی لحاظ سے کجنگی بھی ملتی ہے۔ ”ہندی“ میں جذباتیت کا وہ فوراس کی کمزوری بن کر ابھرا تھا لیکن معصومہ میں جذباتیت کے ساتھ بالغ نظری بھی ملتی ہے جس نے ناول کو ایک معیار عطا کر دیا ہے۔

”سوڈانی“، ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ اگر فلم ”بزدل“ دیکھنے کے بعد اس ناول کو پڑھا جائے تو اس میں کوئی خاص بات نظر نہ آئے گی۔ اس کا پلاٹ اور کردار سبھی پر فلمی انداز حاوی ہے۔ سورج چندر کا بڑا بھائی ہے۔ چاندنی ان دونوں کی مشترکہ محبوبہ ہے۔ مگر وہ پیار چندر سے کرتی ہے۔ اور اوشا اور چندر سورج کو ایک دیوتا کی طرح مانتے ہیں اس کی پرورش ایک خاص اہتمام سے کی گئی ہے صبح و شام اس کی آرتی اتاری جاتی ہے اور اوشا جو اس کی منگیتر بھی ہے اس کی ضروریات کا خیال رکھتی ہے سب اس کو دیوتا کی طرح پوجتے ہیں مگر کوئی اس کے اندر کی تبدیلی اور ابلتے ہوئے جذبات کو سمجھنے کی کوشش

نہیں کرتا۔ وہ بچوں کے ساتھ کھیلنا چاہتا ہے۔ ہنسنا کھیلنا چاہتا ہے۔ مگر چونکہ اس کی پوجا ہوتی ہے اس لئے وہ عام بچوں کی طرح نہیں رہ پاتا ہے۔ اپنی جوانی کے اٹھتے طوفان کو وہ چاندنی سے محبت کرنے پر ملامت کرتا ہے۔ وہ چاندنی کو ہناتا دیکھنے کے لئے غسل خانے کے شیشے کی وارنش کھرچ دیتا ہے۔ اور ایک روز وہ خود پر سے قابو کھو بیٹھتا ہے اور کھڑکی سے اس کے کمرے میں جانے لگتا ہے۔ سورج کی جان بچانے کے لئے وہ چاندنی کو رائے دیتی ہے کہ تم زہر کھا کر مر جاؤ مگر ہوتا اس کا الٹا ہے زہر سورج کھا لیتا ہے اور کہانی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

سودانی میں عصمت نے مثالی اور جذباتی کردار پیش کئے ہیں اور اشاراتی کا کردار بالکل میرا بانی سے ملتا جلتا ہے جن کو یحییٰ میں یہ بتا دیا گیا تھا کہ "کرسن جی" تمہارے پتی ہیں اور تازہ زندگی انہیں اپنا شوہر مانتی رہو۔ عصمت نے چندر کے منہ سے جو مکالمے بیان کروائے ہیں وہ قابل تعریف ہیں۔ ان مکالموں سے نہ صرف ادشا کے کردار پر روشنی پڑتی ہے بلکہ عصمت کا عورتوں کے لئے کیا نظریہ ہے اس کا اندازہ بھی ہوتا ہے رسم و رواج کے خلاف ہندوستانی عورت کی بغاوت اور اس کی ذہنی تبدیلی کا پتہ بھی چلتا ہے۔

چندر کا کردار ترقی پسند ہے وہ نہ صرف چاندنی جیسی لاوارث لڑکی سے پیار کرتا ہے بلکہ بیاہ بھی کر لیتا ہے وہ سورج بڑے سرکار کی طرح صرف لکچر بازی میں یقین نہیں رکھتا اور نہ ہی چھپ چھپ کر غلط حرکت ہی کرتا ہے۔ بلکہ ہمت سے سماج کا مقابلہ کرتا ہے۔ یہ کردار اپنی ارتقائی منزل طے کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے مجموعی طور پر یہ ناول ایک دلچسپ نفسیاتی ناول ہے جو عصمت کے دوسرے ناولوں کے مقابلے میں فنی طور پر کمزور ہے۔ غالباً اسی لئے پروفیسر عبدالسلام نے اپنی کتاب "اردو ناول بیسویں صدی میں" میں تبصرہ کرتے ہوئے "سودانی" کو عصمت چغتائی کا سب سے گھٹیا ناول قرار دیا ہے۔

"دل کی دنیا" ایک ایسا ناول ہے جیسے "لحاف" اس کی کہانی بھی ایک نچی رقیہ حسن کے مشاہدات کے طور پر بیان کی گئی۔ قدسیہ اس ناول کی ہیروئن ہے جس کی

شادی باقر حسین کے ساتھ پندرہ برس کی عمر میں ہو جاتی ہے۔ چھ ماہ کے بعد باقر حسین ولایت چلا جاتا ہے اور پھر دو سال تک خط و کتابت چلنے کے بعد یہ سلسلہ بھی بند کر دیتا ہے جب وہ ولایت سے واپس آتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اس نے دوسری شادی کر لی ہے۔ اور پھر یہ لوگ واپس آکر ہندوستان میں بس جاتے ہیں۔ یہ قصہ شادی کے دس سال بعد شروع ہوتا ہے۔ آخر میں قدسیہ اپنے رشتہ دار شبیر حسن کے ساتھ بھاگ جاتی ہے اور دونوں ولایت میں جا کر بس جاتے ہیں ان کی بیٹی رقیہ حسن ان کے منزار کی داستان بیان کرتی ہے۔

قدسیہ کے شوہر کی دوسری شادی کے بعد قدسیہ خود کو بہت اکیسوس کر رہی ہے۔ اس لئے وہ اپنا دل نیم دیوانی "بوا" کے گانے کو سن کر بہلاتی ہے بوا بھی قدسیہ کی طرح بد نصیبی کا شکار تھی اس کی شادی کے بعد جب برات ندی پار کر رہی تھی سوائے بوا کے سب ڈوب کر مر گئے تھے۔ تبھی سے بوا نیم پاگل سی ہو گئی تھی بوا کے سلگتے گانے اور سریلی آواز سے قدسیہ کا جوان جسم سلگنے لگتا اس کی اس نفسیات کو گھروالے سمجھ نہیں پاتے۔ یہ متوسط گھرانے کی کہانی ہے۔ اس ناول میں جنسی جذبات کا بیان ہے۔

ایک جگہ عصمت لکھتی ہیں کہ مرد سے زیادہ عورت کے لئے جنسی جذبہ ضروری ہے۔ کیونکہ عورت کے یہاں یہ مسئلہ بن جاتا ہے مرد اپنے جنسی جذبے کی تسکین باہر جا کر پوری کر لیتا ہے مگر عورت کیا کرے کہاں جائے۔ اس ناول میں ایک کردار بیچا مستقیم عرف "مچھو" ہے جو بے روک ٹوک طوائفوں کے یہاں جاتے ہیں۔ قدسیہ چونکہ اپنے جذبات کا نہ تو بیان کر پاتی ہے نہ تسکین ہی اس لئے بڑی بے چین رہتی ہے۔ اس کی نانی اس کی بے چینی کو کوئی بیماری سمجھتی ہے اور اسے مذہب اور عبادت کی طرف مائل کرتی ہے۔ لیکن ان سے بھی کوئی آفاقہ نہیں ہوتا۔ قدسیہ خوب جانتی ہے کہ اس کے مرض کا علاج نماز روزہ یا جلاب نہیں بلکہ وہ اپنے علاج کو شبیر حسن (جو اس کا دیورہ) میں دیکھتی ہے مگر وہ ایک دبو شخص ہے جو صرف دور دور سے جذبات تو بھڑکاتا ہے مگر اس کے بعد کچھ نہیں کرتا۔ شبیر حسن کے پاس قدسیہ کی بیماری کا علاج تھا مگر وہ کمزور

مرد ہے جو کھل کر عشق کا اظہار کرنا بھی نہیں جانتا، آخر کار قدسیہ اس سے بھی بور ہو گئی ساری دنیا سے اس کا جی اچٹ گیا وہ بیزار اور بے بس مایوس زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئی مگر اسی موقع پر اس کے چچا مستقیم اسے ایک نئی راہ دکھاتے ہیں کیونکہ وہ قدسیہ کی بیماری کو خوب سمجھتے تھے اور اس کا علاج بھی جانتے تھے۔ ان کی باتوں سے قدسیہ کو بڑا حوصلہ ملتا ہے اور وہ گھر سے بھاگ جاتی ہے اس ناولٹ کے بارے میں زرینہ عقیل کا خیال درست معلوم ہوتا ہے۔

”اشتر کی نقطہ نظر سے عصمت کا ناول ”دل کی دنیا“ کو

اس لئے کامیاب کہا جاسکتا ہے کہ اس میں عورت نے نئی زندگی اور نئی قدروں کا خیر مقدم کیا ہے۔ سماجی نا انصافی کے خلاف بغاوت کی ہے فرسودہ خاندانی روایات کو بے جگری کے ساتھ توڑا ہے۔ اشتر اکیست کا بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان کو اپنی صلاحیتوں سے، اپنی جدوجہد اور محنت سے اپنی دنیا آپ پیدا کرنی چاہیئے اور عصمت نے ان سبھی چیزوں کو قدسیہ بیگم کے کردار میں سمو کر قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ لہ

”باندی“ ناول میں عصمت نے متوسط طبقے سے ہٹ کر نوابین کا ذکر کیا ہے۔ یہاں انہوں نے شیعہ مذہب سے تعلق رکھنے والے گھرانے کی تصویر پیش کی ہے۔ جہاں باندیوں کا استعمال نواب زادوں کے عیش و آرام کا ایک حصہ تھا۔ اور اس بات کو وہ لوگ وقار اور اپنی عزت سمجھتے تھے۔ اس ناولٹ کا موضوع ہے ”باندی“ جو کبھی تو نوابوں کا بستر گرم کرتی ہے تو کبھی خدمت

یہ ناول بھی نفسیاتی ناول کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ نایاب باندی سنوارے پن میں ماں بن جاتی ہے مگر بیوی بننے کی تمنا دل میں لئے رہتی ہے۔ اور اس چیز کا بدلہ وہ اس طرح لیتی ہے کہ دوسری کس باندیوں کو سجا سنوار کر نوابوں کے جوان لڑکوں کی خواب گاہ میں چوری چھپے پہنچا دیتی ہے۔ اب یہی اس کا پیشہ بن جاتا ہے۔ وہ حساس طبیعت کی لڑکی تھی بعد میں وہ کئی بار اس ماحول سے نکلنے کی کوشش بھی کرتی ہے مگر اپنے بیٹے جبار کی

زندگی بنانے کی غرض سے اسی گھر میں رہتی ہے۔ وہ بار بار جبار کو نواب کا حقیقہ بیٹا تصور کرتی ہے۔ اور چاہتی ہے کہ اس کو بھی نوابوں کے بیٹے جیسا وقار ملے۔

نوابوں کے دور میں عورت ان کے ہاتھ کا کھلونا بن کر رہ گئی تھی۔ یہاں عورت کو اپنا کوئی مقام حاصل نہ تھا اگر وہ بیوی تھی تو صرف بچوں کی ماں کہلانے گھر بار چلانے کے لئے۔ بانڈیاں اور طوائفین صرف امیر مردوں کا دل بہلانے کے لئے جن کے پاس پیسہ تھا دولت تھی۔ اس ناول میں مکالموں کے ذریعہ عصمت نے اس خیال کی نقاب کشائی کی ہے جاگیردارانہ نظام میں بدی اور برائی کو جائز رکھنے کے لئے مذہب کا جھوٹا سہارا لیا جاتا تھا۔ مگر کبھی کبھی نوابوں کے یہاں ایماندار اور حقیقت پسند لوگ بھی پیدا ہو جاتے ہیں چھمن میاں اس کی ایک مثال ہیں۔ وہ نواب زادے تو تھے مگر نوابی مزاج اور فضا ان کو برداشت نہیں ہے وہ بوسیدہ رسم و رواج جھوٹی شان اور بے مروت دنیا کو جھوٹ کے جال سے آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ وہ نئی تعلیم کے پروردہ تھے وہ بانڈی کے جسم کو تصرف میں لانے کے خلاف ہیں اور اس رسم بیچ کو توڑ کر افلاس کی زندگی بتاتے ہیں۔ وہ بانڈی کے ساتھ عیاشی نہیں کرتے بلکہ جب وہ ایک بانڈی سے ملتے ہیں تو اسے بانڈی سے بیوی بنا لیتے ہیں دن رات سارے گھر والے ان کو دوسری شادی کرنے پر مجبور کرتے ہیں مگر وہ نہیں ملتے اور اپنی بیوی کی خاطر ساری دولت اور خاندان کو انواع کہہ دیتے ہیں۔

بیوی کے ساتھ وہ شہر چلے جاتے ہیں۔ وہاں نئی زندگی شروع کرتے ہیں۔ وہ سماج سوسائٹی اور رسم و رواج کے خلاف کھڑے ہو کر کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

مجموعی طور پر ”بانڈی“ اوسط درجے کا ناول ہے جس میں نوابوں کی عیاشی اور غریبوں کی مجبوری کے پہلو بہ پہلو نئی سماجی بیداری اور جدوجہد کو بھی پیش کیا گیا ہے اور یہی اس ناول کی خوبی ہے۔

”جنگلی کبوتر“ بھی ایک نفسیاتی ناول ہے اس میں عصمت نے انسانی شعور اور جنسی جذبات کی عکاسی کی ہے۔ ناول کا ہیرو ماجد اپنے معاشقوں کے لئے مشہور ہے اس کے نام کے ساتھ خاندان کی کئی لڑکیوں کا نام جوڑا جاتا ہے رشتہ دار لڑکیاں بڑے

مزے لے لے کر اس کا ذکر ایک دوسرے سے کرتی ہیں۔ اپنے ہی رشتہ داروں میں ایک لڑکی عابدہ سے ان کی شادی ہو جاتی ہے۔ عابدہ اپنے خاوند کی کمزوری سے افاق ہونے کے باوجود اس سے شدید محبت کرتی ہے اور اس طرح ماجد بھی تمام دیگر خرافات کو چھوڑ کر عابدہ کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ بد قسمتی سے عابدہ بالآخر ثابت ہوتی ہے مگر اس کے باوجود بھی وہ دونوں میاں بیوی خوش رہتے ہیں۔

اس ناول کی ابتداء ماجد کی موت کے بعد شروع ہوتی ہے۔ عابدہ اپنی یادوں کے سہارے تمام زندگی کے ازدواجی سفر کو محسوس کرنا شروع کرتی ہے۔ اپنے پلنگ پر خاوند کا حصہ خالی دیکھ کر وہ خیالوں میں ڈوب جاتی ہے۔ شادی کے چند سال بعد عابدہ اپنے خاوند کی اصلاح کا ایک نیا نفسیاتی طریقہ اختیار کرنے کی غرض سے بار بار میکے چلی جاتی ہے اور اپنی غیر موجودگی سے ماجد کے صبر و برداشت کو تقویت دینا چاہتی ہے اور ماجد کے بار بار بلانے پر بھی واپس جلدی نہیں آتی۔ اور آخر میں اس طویل غیر حاضری نے ماجد کے صبر کو توڑ دیا اور وہ جنسی آسودگی کے لئے ایک لڑکی مونا سے دوستی کر لیتا ہے اور وہ ماجد سے حاملہ ہو جاتی ہے۔ عابدہ واپس گھر آتی ہے اور اپنی چیزوں کو غائب پاتی ہے اس دوران اسے ماجد کے حالات بھی معلوم ہو جاتے ہیں وہ ماجد سے تو کچھ نہیں کہتی مگر خود مونا سے ملنے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر عابدہ ان باتوں سے بے خبر مونا کے ہونے والے بچہ کے لئے فکر مند ہے۔ جبکہ ماجد بار بار اپنی مجبوری اور صفائی دیتا ہے۔

”جان من دنیا کی یہ سب سے بھیانک بیماری ہے۔ اس نے بڑے

بڑے مہارشیوں کے چھکے چھڑا دیئے ہیں۔“ — لے

اُدھر ماجد اپنے کئے پر بہت پریشان اور شرمندہ ہے بار بار معافی مانگتا ہے اور عابدہ کے جسم کی قربت کے لئے ترستا ہے۔ مگر بار بار اختلاط کے نفسیاتی مرحلے کے قریب آکر وہ ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں۔

”میرا جسم تمہارے لمس کے لئے سسک رہا ہے۔ نہ جانے“

{ کیا ہوتا ہے شاید کمتری کے احساس سے جھجھک کر مفلوج ہو جاتا ہے۔
عابدہ پہلے مونا اور اس کی بچی کا خرچ کھلم کھلا دیتی ہے مگر پھر ماجد سے چھپا کر اس کا خرچ پورا
کرتی ہے وہ چاہتی ہے کہ مونا بچی کو عابدہ کو دے دے تاکہ بچی کی زندگی بہتر گزر سکے مگر جب
وہ بچی دینے سے انکار کر دیتی ہے تو پھر عابدہ خرچ دینا بند کر دیتی ہے۔

ماجد تمام ناول میں میاں بیوی کے رشتے کو بہتر کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے
مگر عابدہ کا جسم باوجود اس سے محبت کرنے کے ماجد کے جسم کو قبول نہیں کرتا۔ عابدہ
ذہنی طور پر ٹوٹ جاتی ہے۔ کیونکہ جس بھر دسہ اور یقین کو اس نے اپنے اور ماجد کے
درمیان قائم کرنے کی کوشش کی تھی وہ ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ ماجد خود نفسیاتی مرض کا
شکار ہو چکا تھا۔ وہ اپنے کئے پر پشیمان تھا وہ جب بھی عابدہ کے پاس جاتا ہے ذہن اور
جسم میں جنگ شروع ہو جاتی ہے شعور میں چھپا ہوا احساس جرم اس کے جسم کو اپاہج کر کے
رکھ دیتا ہے۔ اور دوسری طرف عابدہ کا دل بے اعتباری اور کراہیت کے بوجھ سے دبا
سا رہتا تھا۔ عابدہ کو اپنی محبت کا واسطہ دیتا ہے۔ مگر عابدہ جیسے ہی ماجد کے پاس آتی
ہے اسے ”جھوٹی رکا بنی“ کا تصور آگھیرتا ہے۔ ماجد بہت کوشش کرتا ہے کہ دونوں پھر
مل جائیں مگر ناکامیابی ہی ہاتھ آتی ہے۔ آخر میں ماجد طنز سے اس کے خلوص اور محبت
کا مذاق بھی اڑاتا ہے عابدہ ماجد کی حرکت کو ناقابل معافی مانتی ہے تب وہ ایک مثال دیتی
ہے وہ ایک گلاس توڑ کر کہتی ہے کہ کیا تم ان شیشوں کو آپس میں جوڑ سکتے ہو؟ نہیں نا
اس طرح ہم بھی کبھی نہیں مل سکتے۔ ماجد عابدہ کو یاد دلاتا ہے کہ پہلے ہم کتنے خوش تھے
ہر وقت ہنسی مذاق کیا کرتے تھے، ماجد عابدہ کو چھیڑا کرتا تھا۔ مگر اس کے باوجود بھی
عابدہ شوہر سے تعلق قائم نہ کر پاتی۔

خود سے } بورا ناولٹ ایک ذہنی اور جسمانی کشمکش کے درمیان الجھا رہتا ہے۔ عابدہ بائجھ
پن کے باعث احساس کمتری کی شکار ہے اور اسی نفسیاتی الجھن کے تحت وہ ماجد کو معاف
نہیں کر پاتی اور ادھر ماجد اپنی غلطی کی تلافی بیار کر کے کرنا چاہتا ہے مگر وہ جسم ایک جان نہیں

بن پلاتے کیونکہ جب جسم پاس آتا ہے تو روح کچھ کھتی ہے اور جب روح ملامت کرتی ہے جسم قریب آنے سے گھبراتا ہے۔

ادھر مونا اپنے اور بچی کو پالنے کے لئے جسم کا سودا کرتی ہے وہ سماج میں ایک ماں اور ایک بیوی تو بن نہیں پاتی بھتی لہذا اس نے بچے کو عابدہ کو دیدیا تاکہ وہ عزت کی زندگی گزار سکے۔

آخر میں ایک لمبی بیماری اور بوکری چھوڑنے کے بعد ماجد اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں مونا کی بچی اس کی خالی جگہ لے لیتی ہے۔ اس وقت اس کا ذہن اور روح دونوں نیند میں ہے۔ عصمت کا یہ ناولٹ مکمل طور پر نفسیاتی ناولٹ ہے۔ جس میں مرد عورت کے نفسیاتی کوائف کی بہترین عکاسی ملتی ہے۔ نفسیاتی کشمکش اس ناول کی ایک دوسری خوبی ہے جس کی پیش کش میں عصمت چغتائی نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ ”عجیب آدمی“ عصمت کا ایک مختصر ناول ہے۔ جو ان کے دیگر ناولوں کی طرح فلمی دنیا کے ارد گرد گھومتا نظر آتا ہے۔ عجیب آدمی ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو شروع میں مفلس تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ وہ ترقی کرتا گیا اور کافی مالدار آدمی بن گیا اور یہیں سے اس کے کردار کی کج روی شروع ہوتی ہے۔

اس ناول کا ہیرو دھرم دیو ہے جو شروع میں نہایت جھینپو سا کم عمر لڑکا تھا وہ اور اس کے دوست فلمی دنیا میں اپنی قسمت آزما رہے تھے وہ ممبئی ٹاکنز کے احاطے میں بیٹھ کر اکثر منہسی مذاق کیا کرتے تھے۔ یہیں اس کی ملاقات منگلا نام کی ایک لڑکی سے ہو جاتی ہے جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ایک عاشق مزاج آدمی ہے اس سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے اور پھر دھرم دیو کی شادی منگلا سے ہو جاتی ہے۔ دھرم دیو چونکہ ذہین اور محنتی آدمی تھا اس لئے آگے چل کر وہ بڑا ڈائریکٹر اور پروڈیوسر بن جاتا ہے اور اپنی ذاتی فلمی کمپنی قائم کرتا ہے اور ایک بڑے سرمایہ دار شخص کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔

دھرم دیو طبعاً عاشق مزاج واقع ہوا ہے اس لئے وہ کئی لڑکیوں سے عشق کرتا ہے حالانکہ اب منگلا اس کی زندگی میں آگئی بھتی پھر بھی وہ اپنی افتاد طبع سے مجبور ہو کر رہتا۔ نام کی ایک لڑکی سے محبت کرنے لگتا ہے مگر جلد ہی ریتا کی شادی ہو جاتی ہے

منگلا پھر بھی دھرم دیو کے بارے میں جاسوسی کر داتی رہتی ہے کہ کہیں وہ عشق تو نہیں کر رہا ہے۔ مگر اسے کیا خبر تھی کہ جس زرینہ نام کی لڑکی کو وہ اپنی چھوٹی بہن بنا کر گھر میں رکھے ہوئے ہے وہی اس کی سوت ہے منگلا تو اسے بہت پیار کرتی تھی۔ بمبئی کی زندگی کے بارے میں اسے سمجھایا کرتی تھی بچے بھی اس سے بہت مانوس ہو گئے تھے پہلے منگلا کو دھرم دیو پر شک ہوتا ہے۔ بعد میں یہ شک یقین میں بدل جاتا ہے۔ وہ اندر سے ٹوٹ جاتی ہے اور اپنے غم کو بھلا۔ نہ کے لئے شراب کا سہارا لیتی ہے۔ اُدھر دھرم دیو بھی زرینہ کے عشق میں ناکام ہو کر خودکشی کی کوشش کرتا ہے مگر خوش قسمتی سے بچ جاتا ہے اور پھر زرینہ کی طرف لوٹنا چاہتا ہے مگر دو عورتوں کی محبت کے چکر میں وہ کسی کا بھی نہیں ہو پاتا اور بالآخر مایوس ہو کر اپنی زندگی ختم کر لیتا ہے۔

”عجیب آدمی“ مجموعی طور پر ایک اوسط درجے کا ناول ہے جس میں مرد کی فطرت اور اس کی ذہنی کش مکش کا فنکارانہ اظہار خصوصیت کے ساتھ ملتا ہے۔

”ایک قطرہ خون“ عصمت چغتائی کا ایک ایسا ناول ہے جو واقعہ کر بلا پر لکھا گیا ہے یہ ناول عصمت نے میر انیس کے مرثیوں سے متاثر ہو کر لکھا ہے جیسا کہ وہ خود لکھتی ہیں کہ ”انیس کے نام“ یہ کہانی میں نے ان کے مرثیوں میں پائی ہے۔“ لے

اس ناول میں عصمت نے کر بلا کے تاریخی واقعے کو ناول کے پیرائے میں پیش کیا ہے۔ ناول کے ہیرو کر بلا کے وہ بہتر (۷۲) شہداء ہیں جنہوں نے حق کے لئے اپنی جانیں قربان کر دیں مگر باطل کے سامنے اپنا سر نہ جھکایا۔ اس ناول کے ”پیش لفظ“ میں عصمت لکھتی ہیں۔

”یہ ان بہتر انسانوں کی کہانی ہے جنہوں نے انسانی حقوق کی خاطر سامراج سے ٹکری۔“

یہ چودہ سو سال پرانی کہانی آج کی کہانی ہے کہ آج بھی انسان کا سب سے بڑا دشمن انسان کہلاتا ہے۔

آج بھی انسانیت کا علم بردار انسان ہے۔ آج بھی جب دنیا کے کسی
 کو نے میں کوئی یزید سراٹھاتا ہے تو حسینؑ بڑھ کر اس کی کلائی ٹوڑ دیتے ہیں
 آج بھی اُجالا اندھیرے سے برسرِ پیکار ہے۔

اس ناول میں عصمت نے کوئی نئی کہانی کوئی نیا پلاٹ پیش نہیں کیا ہے بلکہ میرا نیس
 کے مرثیوں کو ناول کی شکل میں بیان کر دیا ہے واقعات میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے
 تاہم اس کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اسے عصمت چغتائی نے لکھا ہے انیس کے
 یہاں سانحہ کربلا کا بیان الگ الگ مرثیوں میں ملتا ہے لیکن اس ناول میں اسے سلسلے
 وار پیش کیا گیا ہے۔ اس کام میں عصمت خاصی کامیاب ہوئی ہیں۔ انہوں نے مختلف
 مرثیوں میں بیان کردہ واقعات کو جس حسن خوبی سے اپنے ناول میں پیش کیا ہے وہ
 قابلِ داد ہے۔ بقول ڈاکٹر شارب رد دلولی

”وہ تمام واقعات جو انیس کے مرثیوں میں کہیں اختصار اور
 کہیں تفصیل اور کہیں صرف اشاروں میں آئے ہیں۔ انہیں ترتیب دیکھ
 مفصل طور پر بیان کرنے کی ضرورت تھی جسے عصمت چغتائی نے پورا
 کر کے ایک بہت بڑا کام انجام دیا ہے۔“

مرثیوں میں اکثر واقعات کو مختصر کر کے اور کچھ کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے مگر عصمت نے
 ان سبھی واقعات کو چاہے وہ امام حسینؑ کے بچپن کے ہوں چاہے میدان کربلا کی جنگ سے
 متعلق ہوں حر کی بیوی کا حرم میں کھانا لے کر جانے کا واقعہ ہو حضرت علیؑ اصغر اور
 امام حسینؑ کی شہادت ہو یا نصیحتیں ہوں۔ اس میں عصمت نے بچپن کے واقعات کو اس
 طرح بیان کیا ہے کہ آنکھوں کے سامنے حضرت امام حسنؑ کا بچپن گھوم جاتا ہے وہ عام بچوں
 کی طرح ہند کرتے ہیں اپنی باتیں منواتے ہیں، نانا سے بھائی کی شکایت کرتے ہیں یہاں
 سے لے کر آخر میں کربلا کے میدان جنگ میں امام کی لڑائی کا منظر ایسا بیان کیا ہے کہ

آنکھوں کے سامنے سارا منظر گھوم جاتا ہے۔ یہ عصمت کے زورِ قلم کا جادو ہی ہے مرثیوں کے ان پکھرے ہوئے خیالات اور واقعات کو عصمت نے اس انداز میں پیش کیا ہے کہ ہمیں بھی تسلسل ٹوٹنے نہیں پاتا اور قاری خود کو ان کے قلم کے طلسم میں اسیر پاتا ہے۔ ناول کی زبان نہایت آسان اور سلیس ہے مرثی انیس کی تشبیہات اور استعارات کا استعمال نہایت خوبی سے ہوا ہے۔

اکثر جگہوں پر تو پورے پورے مصرعے نقل کر دیے گئے ہیں۔ مگر اس خوبی کے ساتھ کہ یہ عیب لگنے کے بجائے اور بھی زیادہ خوبصورت معلوم ہوتے ہیں اور ناول کی دلچسپی میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔

”ایک قطرہ خون“ میں جذبات نگاری کی بھی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ باپ بیٹی کا رشتہ، شوہر بیوی کا رشتہ، بہن بھائی کا رشتہ اور بیٹی اور ماں کے رشتہ کو جس خوبصورتی کے ساتھ عصمت نے بیان کیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے واقعات کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ اکثر جگہوں پر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں شاربِ ردولوی ایک قطرہ خون پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”اس ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے عصمت

چغتائی نے کسی جگہ بھی اس عظیم قربانی کے انسانی اور اخلاقی مقصد کو کم نہیں ہونے دیا ہے۔“

ان خوبیوں سے قطع نظر اس ناول میں کہیں کہیں جھول بھی نظر آتا ہے ایک دو جگہ تاریخی غلطیاں بھی ملتی ہیں۔ ایک جگہ تو وہ ہے کہ جہاں عصمت نے علی اصغر کو چھ سال کا بچہ بتایا ہے۔ اور دوسری جگہ آپ نے محرم کی چار تاریخ سے پانی کے بند ہونے کا ذکر کیا ہے۔ یہ دونوں باتیں تاریخی اعتبار سے غلط ہیں۔

حدیث اور عقیدے کے مطابق علی اصغر چھ سال کے بچے نہیں بلکہ چھ مہینے کے بچے تھے اور محرم کی چار تاریخ سے نہیں بلکہ سات محرم سے پانی بند ہوا تھا۔

یڑھی لکیریں قصہ اور پلاٹ

ارسطو نے اپنی کتاب ”بوطیقا“ میں پلاٹ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے
 پلاٹ کی ذیل میں آغاز و وسط اور اختتام ہونا چاہیئے ”آغاز“ وہ ہے جو لازمی طور
 پر کسی دوسری چیز کے بعد نہیں آتا حالانکہ کوئی اور چیز موجود ہوتی ہے یا اس کے
 بعد آتی ہے۔ برخلاف اس کے ”خاتمہ“ وہ ہے جو ضروری یا عام نتیجہ کے طور
 پر کسی چیز کے بعد آتا ہے اور اس کے بعد کچھ اور نہیں آتا ”وسط“ وہ ہے
 جو کسی چیز کے بعد آتا ہے اور اس کے بعد بھی کوئی چیز آتی ہے۔

کسی واقعہ کو بیان کرنے کے لئے پلاٹ کی ضرورت ہوتی ہے جیسے کسی واقعہ کو کس طرح پیش
 کریں اس میں کہاں دلچسپیاں پیدا کریں اور کس انداز سے کہانی کی شروعات کریں۔ ناظرین
 کی دلچسپی کس کس جگہ بڑھائیں جس سے قصہ موثر ہو اور قارئین کو دلچسپ لگے۔ ناول کا
 فن“ میں ای۔ ایم فارسٹر پلاٹ اور کہانی کا جو فرق بتاتے ہیں وہ خاصی اہمیت رکھتا
 ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

پلاٹ بھی واقعات ہی کا بیان ہے مگر اس میں اسباب و عمل پر
 زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ ————— ”بادشاہ مرا اور پھر ملکہ مر گئی۔“
 یہ ایک کہانی ہے۔ بادشاہ مرا اور پھر اس کی موت کے غم میں ملکہ مر گئی۔
 یہ ایک پلاٹ ہے۔ —————

گویا اگر ”ٹیلرھی لکیر“ کے پلاٹ پر بات کریں گے تو یہ بات بھی صاف ہوتی چاہیئے کہ دشمن کے کردار
 کی کج روی اور نفسیاتی الجھنوں کی وجہ کیا ہے۔ یعنی صرف واقعے کے بیان سے کام نہیں چلے گا

بلکہ اس کی وجہ پر بھی توجہ دینی ہوگی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ————— ”پلاٹ کا خالق ہم سے واقعات کو یاد رکھنے کی امید رکھتا ہے اور ہم اس سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ کوئی سیرا ڈھیلا نہ چھوڑے گا۔“ ۱

اس لئے نہ پلاٹ بہت لمبا چوڑا ہو کہ کہانی بھولی جائے اور نہ دار کو یاد رکھنے میں دقت ہو۔ پلاٹ کے معاملے میں پریم چند کا ”گو دان“ بہت پیچیدہ ہے جس میں چند کرداروں کے علاوہ بھی آپس میں مل جاتے ہیں اور واقعہ کو یاد رکھنے میں پریشانی ہوتی ہے مگر ”پیڑھی لکیر“ کا پلاٹ طویل ہونے کے باوجود الجھا ہوا نہیں ہے بلکہ ہر واقعہ ایک علیحدہ افسانہ کی طرح دلچسپ اور ایک زنجیر کی طرح آپس میں ملا ہوا ہے۔ حالانکہ کردار بہت زیادہ ہیں مگر سب بہت جلدی اپنا اپنا کام کر کے معدوم ہو جاتے ہیں ڈاکٹر محمد حسن فاروقی کے نزدیک پلاٹ دو طرح کا ہوتا ہے ایک ”ڈھیلا“ دوسرا ”گٹھا“ ہوا

”اول میں متعدد قسم کے واقعات ایک ہی شخص سے متعلق ہوتے ہیں اور ان واقعات میں ایک دوسرے سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہوتا۔

دوسرے میں (گٹھا ہوا پلاٹ) ایک واقعہ دوسرے سے اس طرح منسلک رہتا ہے جیسے ایک مشین کے مختلف پرزے۔ اچھے ناولوں میں عموماً توازن ترتیب اور ہیئت کا خیال رکھا جاتا ہے اور پلاٹ کو بھی کافی لچکدار بنایا جاتا ہے ورنہ مکمل طور پر گٹھا ہوا پلاٹ تو محض ریاضی کا فارمولا ہو کر رہ جائے گا حقیقت یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ غور سے بنایا ہوا پلاٹ میکانیکی ہو جاتا ہے۔ اس میں آورد پیدا ہو جاتی ہے۔ اور قصہ بالکل گرگٹھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے بڑے ناول نگاروں کے پلاٹ تمام تر بے حد گٹھے ہوئے نہیں ہوتے اور کسی ناول میں پلاٹ کا گٹھا ہوا ہونا اس کی تعریف بھی نہیں ہوتی ضروری بات یہ ہے کہ پلاٹ کا مجموعی اثر نہ بگڑنے پائے۔“ ۲

عصمت چغتائی کے ناول ٹیڑھی لکیر میں قصہ اور پلاٹ کس حد تک ہم آہنگ ہیں۔ کیا یہ کہانی کرداروں کے ساتھ چلتی ہے یا انہیں اکیلا ہی کہانی کے جال میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیتی ہے۔ یہ ناول ایک تعلیم یافتہ لڑکی کی داستانِ حیات ہے۔ اس ناول کو کچھ نقاد سوانحی ناول بھی مانتے ہیں

شمشاد یعنی شمن اپنے ماں باپ کی دسویں اولاد تھی گھر میں چونکہ پیسہ تھا اس لئے سبھی بچے جانوروں کی طرح پل رہے تھے۔ جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے جس گھر میں زیادہ بچے ہوتے ہیں عموماً گھر کی بڑی بہن چھوٹے بچوں کو پالتی ہے۔ مگر شمن کی بڑی بہن جسے سب "آپا" کہتے تھے اس کی طرف توجہ نہیں دیتی۔ اس گھر میں ماں صرف بچوں کو پیدا کرتی ہے۔ پالتی نہیں۔ لہذا اگر وہ سے ایک انا بلانی جاتی ہے جو شروع میں شمن کی پرورش کرتی ہے یہ انا سولہ سترہ برس کی جوان لڑکی تھی اس وجہ سے شمن کی خواہشات کو ٹھیک سے نہ سمجھ پاتی اور شمن غلاظت میں بڑی رویا کرتی اس انا کا ایک عاشق بھی تھا جس کا راز جلد ہی فاش ہو گیا اور انا کو واپس آگے بھیج دیا گیا۔ یہ شمن کی زندگی کا دوسرا حادثہ تھا۔ بڑی آپا چونکہ اماں کی اولادوں کی پرورش کرتے کرتے بور ہو چکی تھیں اس وجہ سے انہوں نے شمن کی پرورش کی طرف توجہ نہ دی مگر منجھو (جو آپا سے چھوٹی بہن تھی) نے شمن کو پالنے کی ذمہ داری لے لی۔ منجھو نے جہاں شمن کو پیار دیا وہیں اسے بے انتہا مارا بھی۔ صفائی کی اس قدر تاکید کی کہ وہ گندگی کی طرف زیادہ زیادہ مائل ہوتی گئی۔ دھول مٹی میں کھیلنا۔ مٹی کھانا۔ گلے بیلوں کے باڑے میں گھومنا اس کی عادت میں شمار ہو گیا۔ اس کی دوست بھنگن کی لڑکی تھی اس لئے گندگی سے اور بھی لگاؤ پیدا ہو گیا منجھو چونکہ خود ماں نہ تھی اس لئے وہ اسے پیار تو دے سکتی تھی مگر ماں کی ممتا نہیں جس کی اسے ضرورت تھی۔ ہر بچے کو ممتا اور پیار کی ضرورت پڑتی ہے مگر شمن اس سے محروم رہی زندگی گزارنی تھی اور وہ گزار رہی تھی۔ منجھو نے اس سے کبھی سیدھے منہ بات نہ کی اسے ہر بات پر مار پڑی اور اسی مارنے سے ٹیڑھا بنا نا شروع کر دیا۔ اب وہ بات بات پر صند کر فی گندگی میں کھیلتی اور خوب گندی ہونی مٹی تو وہ ایسے کھایا کرتی جیسے کوئی حاملہ عورت ہو، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے پیٹ میں کیچوے پڑ گئے۔ سب گھر میں اسے "بھتنی" کہتے اور وہ کسی نوخوار بلی کی طرح جھپٹ پڑتی اور غصہ میں ایسا نوچتی کہ لوگوں کے گوشت میں ناخن گر جاتے

اور خون بہنے لگتا وہ ان لوگوں کی وجہ سے منجھوبی کو مارنے لگی۔ تخیل میں ٹھیک اسی طرح گھس گھس کر ہنلاتی جس طرح منجھوبی ہنلاتی تھی جی نہ بھرتا تو بے جان چیزوں سے بدلہ لینے لگی اپنے غصہ اپنے بھڑکے ہوئے جذبات کو کم کرنے کے لئے ایک روز اس نے اپنی گڑیا کو خوب مارا اور ہاتھ پیر الگ الگ کر اس کا برادہ نکال کر اسے چپن ملا۔ تبھی اسے معلوم ہوا کہ اس کو اب پڑھنا بھی ہے اس کی بہن نے قاعدہ لیکر پڑھانا شروع کیا۔ شمن یہ "الف" ہے مگر شمن کو یقین نہ آیا۔ اور اسی طرح جب اسے بتاتی ہے کہ یہ "ص۔ ص۔" ہے تو اسے بالکل ہی اعتبار نہ ہوا کیونکہ یہ تو چائے دانی کی شکل کا معلوم ہوتا ہے اور اسکے صبر کا پیمانہ تو اس وقت لبریز ہو واجب "ا" سے انار کہنے کو کہا گیا۔ اسے قطعی یقین نہ آیا کیوں کہ ایک تو "الف" لمبا ہے اور "انار" گول اور پھر "الف" سے "انار" کیسے ہو سکتا ہے۔ اس مقام پر معلوم ہوتا ہے کہ اگل کا دماغ نیز اور تخیل بلند ہے بات کو جب تک اچھی طرح سمجھ نہ جائے مانتی نہیں ہے آخر کار شمن نے اس کتاب سے یہ سوچ کر سمجھوتا کر لیا کہ اس کے بعد تو پڑھانی ختم ہو جائیگی مگر اس کو یہ جان کر سخت کوفت ہوئی کہ اس کی پڑھانی تو اب شروع ہوئی ہے آگے بھائی کی طرح موٹی موٹی کتابیں پڑھنی پڑیں گی۔

پھر وہ دن آگیا جب منجھوبی دلہن بنی بیٹھی تھی کوئی شمن کو دیکھنے والا نہ تھا۔ لہذا اس نے اپنے خالی وقت کو ہنایت بے تکے کاموں میں صرف کر دیا۔ جیسے بری، کی شکر کو غسل خانے کے مشکوں میں گھول دیا۔ کچن میں جا کر کھانوں میں نمک اور کوئلہ کی راکھ ملا دی اور کھیلنے کھیلنے گھر میں گر پڑی۔ کسی نے اسے ہنلانے کی کوشش کی تو آدھا ہنسا کر ہی بھاگ آئی اور تولیہ لپیٹ کر تین دن تک گھومتی رہی۔ موقع دیکھ کر وہ جہیز کے کمرے میں گھس گئی اور سب کپڑوں کو نوچ ڈالا۔ تولیہ باندھ کر وہ سمجھنی بچوں میں ایک انوکھی چیز بن گئی تھی یہاں عصمت نے بچوں کی نفسیات کی بڑی باریک مثال پیش کی ہے۔ وہ یہ کہ سمجھنی بچے اس تاک میں تھے کہ وہ اسے تولیے سے الگ کر کے کسی طرح ننگا دیکھ لیں۔ یہاں تک شمن کی شرارتیں اپنے عروج پر نظر آتی ہیں جو تاجپرائی کی ایک رسم میں شمن کو جو تاج چھپانے کے لئے دیا جاتا ہے اور وہ اسے پانی کے مٹکے میں ڈال آتی ہے اسی پانی سے سمدھنوں کو خوب شربت پلایا گیا منجھو کے سسرال چلے جانے کے بعد وہ لاوارث ہو گئی کئی روز بعد جب گندگی سے بے حال ہو گئی تو اماں کو اسے ہنلانے کا حیاں آیا۔ وہ رات دن منجھو کو یاد کرتی اسے پکارا کرتی

اور منجھو بی کے شوہر کے مر جانے کی دعائیں مانگا کرتی کہ اسی اثنا میں اسے خبر ملی کہ اس کی بہن کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ بہت خوش تھی کہ خدا نے اس کی دعا، سن لی ہے مگر جلد ہی اس کی خوشی پر پانی پھر گیا کیونکہ آپا کے شوہر کا انتقال ہوا تھا اور وہ اب مستقل طور سے یہیں رہنے آرہی تھیں یہی سہی کسر آپا نے آکر پوری کر دی۔ وہ بات بات پر اپنی بیٹی نوری سے مقابلہ کرتی اور اسے نیچا دکھانے کی کوشش کرتی۔ دوسروں کے سامنے اس کی برائی ہوتی اس کا مذاق اڑاتیں نوری اچھا ثابت کرنے کے لئے شمن کو برا بھلا کہتا ہے۔ شمن اسی دوران احساس کمتری کی زبردست شکار ہو گئی۔ اور اب حالت یہ تھی کہ وہ کونوں کتروں میں بھٹکا کرتی رویا کرتی کسی کے سامنے نہ آتی۔ منجھو کے واپس آنے پر اس کو صدمہ یہ پہنچا کہ وہ اس کی طرح گندی اور ادا اس نہیں تھی بلکہ عمدہ کپڑوں میں ملبوس تھی آتے ہی سب سے گلے مل کر خوب روئی مگر شمن کو بڑی دیر بعد یاد کیا۔ تبھی بڑی آپا کا حکم بھی مل گیا خبردار جو یوں گندی سی منجھو کے کمرے میں گئی وہ تو غنیمت تھا کہ منجھو نے اسی وقت آکر پرانے گھونسے اور تھپڑ مارے کہ وہ مارے خوشی کے رو پڑی۔ کسی نے تو اسے دیکھا کسی نے تو اس کی طرف بھی توجہ دی اور اسی خوشی میں وہ دسترخوان پر خوب صند کر کے کھانے کھاتی ہے اس کی یہ ادا آپا کو ایک آنکھ نہ بھائی وہ اسے چپکے سے خوب ڈانٹتی ہیں اور ایک بار پھر اس نے اپنا غصہ بے جان چیزوں پر اتارا اس نے اپنے انتقام کے جذبے کی تسکین کے لئے آپا کی ہری بھری کیاری کو نوچ ڈالا۔ برباد کر ڈالا اور اس قدر روئی کہ نکسیر پھوٹ نکلی اور وہ کافی دنوں تک بیمار پڑی رہی۔

بیماری سے اٹھنے کے بعد اسے منجھو کے ساتھ اس کی سسرال بھیج دیا گیا۔ وہاں منجھو کی ساس اور اس کا پوتا کڈن دونوں کو ہی اس نے ناپسند کیا کڈن کو پہلے ہی دن اتنا مارا کہ وہ شمن کے رعب میں آگیا۔ شمن نے کڈن کو بالکل پسند نہ کیا۔ کیونکہ ایک تو وہ سب کے کام بغیر کچھ کہے سن کر دیتا اور دوسرے اپنی دادی کے پاس ہمیشہ گھسار ہتا مگر مجبوری میں شمن نے کڈن سے دوستی کر لی لیکن جب کڈن کی دادی نے شمن کی بوئی ہوئی گولی زمین سے نکال کر دھو ڈالی تو اس پر پھر غصے کا دورہ پڑ گیا اور دادی کی ساری کیاری نوچ کر برباد کر ڈالی۔

ماں کیسے بن سکتی ہے ابھی تو اس کی شادی بھی نہیں ہوئی ہے اور تب اسے خوب ساری
نئی نئی باتیں معلوم ہونیں۔

بڑی آپاشمن کو جس قدر باتیں اور ذلیل کرتی تھیں وہ سب کا بدلہ ہاسٹل میں نوری
سے لینے لگی۔ آخر پریشان ہو کر آپا نے پرنسپل کو لکھا کہ نوری کو شمن کے کمرے سے الگ
کر دیا جائے ایسا ہی ہوا نوری دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اور شمن کے کمرے میں رسول
فاطمہ نام کی دوسری لڑکی آگئی جو ہم جنسیت کی شکار تھی۔ رسول فاطمہ سے بچنے کے لئے وہ
اپنی دوست سعادت کے کمرے میں چلی جاتی ہے مگر وہاں بھی یہی سب کچھ تھا۔ سعادت بچہ
پر مار کرتی تھی آخر کار شمن بھی اس بیماری میں مبتلا ہو جاتی ہے ویسے یہ ہاسٹل ایسا تھا جہاں
”مرنے والیوں“ کی پوری فوج موجود تھی۔

”ٹیرھی لکیر“ کو عصمت نے تین منزلوں میں بانٹا ہے۔ یہاں پر اگر دوسری منزل
شروع ہوتی ہے۔ سعادت اپنی خراب صحت کی وجہ سے پہاڑ پر چلی گئی تھی اس کی سہیلی
بلقیس کی بڑی بہن جو انگلینڈ سے واپس آئیں تھیں اسکول کی نئی پرنسپل بن گئیں اور اپنی
پانچ بہنوں کے ساتھ اسکول کے احاطے میں رہتی تھیں پرنسپل اپنی سبھی بہنوں کے ساتھ کھلے طور
پر لڑکوں سے عشق کیا کرتی بلقیس نے ہی شمن کو ایک نئی اور اہم بات یہ بتائی کہ لڑکیوں کو
ہمیشہ لڑکوں پر مرنا چاہیے۔ اور اس طرح بلقیس نے ہی شمن کا پہلا پیارا اپنے بھائی رشید
کو دیا۔ اسکول میں پرنسپل اور ان کی جائز بہنوں کے عاشقوں کے چرچے عام ہونے کے
ساتھ ساتھ اسکول کی لڑکیاں بھی اب لڑکوں پر عاشق ہونے لگیں۔ اور کوڑیا لوں کا ذکر عام
ہو گیا راتوں کو بلقیس اپنے عاشقوں کے قصہ سنایا کرتی اس کے عاشقوں کی گنتی مگر نا آسان
نہ تھا۔ ادھر رشید اور شمن کا عشق پر و ان چڑھتا رہا بلقیس قاصد کا کام کرتی رہی اسی بیچ
نسیم اور کوکو نے آکر نہ صرف رشید کو شمن سے الگ کر دیا بلکہ چند دنوں کے لئے بلقیس
بھی شمن سے الگ ہو گئی۔ نسیم چونکہ امیر گھرانے کی لڑکی تھی لہذا اس کا اثر خاص طور سے ہاسٹل
کی لڑکیوں پر ہوا اس راہ ہاسٹل فیشن کا میدان بن کر رہ گیا۔ ان ہی دنوں معلوم ہوا کہ رشید
انگلینڈ پڑھائی کرنے چلا گیا ہے۔ یہ حادثہ کچھ اس طرح گزرا کہ شمن پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا،
ایسا لگا جیسے کوئی فلم چلتے چلتے رک گئی ہو اس طرح شمن اپنے پہلے عشق میں ناکام میاب

ہوتی ہے۔

بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ ”آپا“ میں بھی کافی تبدیلیاں آگئیں اب وہ بہت خاموش رہنے لگیں تھیں ان کی دوستی مونچھوں والی عزیزہ بیگم سے ہوئی تھی جن سے سارے گھر کے لڑکے پردہ کرتے ان دونوں میں بھی ”ہم جنسیت“ کا رشتہ تھا گو عصمت نے اس کا بیان وضاحت سے نہیں کیا ہے مگر اس طرف بلیغ اشارہ ضرور کیا ہے۔ اسی زمانے میں شمن کا خالہ زاد بھائی ”اجو“ عرف اعجاز ان کے گھر رہنے کے لئے آگیا کیونکہ اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا اور ماں نے دوسری شادی کر لی تھی۔ اجو نہایت بے وقوف اور بدھوت تھا اس کو سب چھیڑتے اس کے گنجے سر پر ”دھولیں“ مارتے اجو چھوٹے سے چھوٹا اور بدترین کام بھی ”جھوٹے“ کھانے کے بدلے میں کر دیا کرتا تھا۔ وہ گھر کا کام بہت مستعدی سے کرتا اسے بچے ہوئے جھوٹے کھانے سے خاص دلچسپی تھی وہ مرغیوں کے ”دانوں“ کتوں کے راتب، اور برتنوں میں بچے ہوئے کھانے بھی چوری چھپے کھا لیا کرتا تھا۔ بچپن میں اجو کی شادی شمن سے طے ہو گئی تھی۔ وہ شمن سے نہایت جھڑے انداز میں محبت کا اظہار کرتا ہے۔ رات کو جب سب سو جاتے تو وہ گھنٹوں شمن کے پلنگ کے پاس پانی پینے کے بہانے اس تاک میں کھڑا رہتا کہ شمن کے جسم کو چھو سکے۔ مگر شمن کو اعجاز بالکل پسند نہ تھا آخر کار وہ شمن کی جوتی سے مار کھا کر زبردست بیمار پڑ جاتا ہے اور پھر بڑھائی کی غرض سے کہیں اور چلا جاتا ہے۔

اجو کے بعد ناول میں عباس کی آمد ہوتی ہے۔ یہ شمن کے چچا کا لڑکا ہے جو انگلینڈ سے انجنیئر بن کر آیا ہے یہ وہی چچا ہیں جن کی آمد پر سب خفا ہوتے ہیں اور ڈیوڑھی میں پلنگ کچھو دیا جاتا، نوکر کھانا دے آتے اس بار جب اپنے بیٹے کے ساتھ آئے تو خوب عزت ہوئی۔ عباس سے کبھی لوگ اپنی اپنی لڑکی کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ وہ لڑکے کو پھنسانے کے لئے چچا چچی اور ان کی لڑکی کی خوب خاطر داری کرتے۔ گھر کی سبھی جوان لڑکیوں سے عباس دلچسپی رکھتا ہے گا ہے گا ہے لڑکیوں کو پکڑنا اور چھیڑنا تو جیسے اس کا من پسند مشغلہ تھا۔ گھر والے اسی لالچ میں تھے کہ چچا چچی ان کی بیٹی کو اپنی بہو بنانا پسند کریں گے مگر چلتے وقت چچا نے عباس کی شادی کا نیوٹا دیکر سب کو ناامید کر دیا۔ شمن واپس اسکول آتی

خالہ زاد
بھائی اجو
(اجن)

عباس
چچا چچی کا
بیٹا

ہے تو یہاں اس کی ملاقات رائے صاحب اور ان کی بیٹی پریمیا اور بیٹے نریندر سے ہوتی ہے۔

پریمیا شمن کی دوست ہے وہ اپنے والد سے بہت پیار کرتی ہے اور وہ بھی نہ صرف اسے بیٹی بلکہ اپنی دوست مانتے ہیں رائے صاحب کی شخصیت رعب دار اور متاثر کرنے والی ہے۔ شمن سے بھی وہ بڑے کھلے انداز میں بات کرتے اور شفقت کا اظہار کرتے ہیں شمن چونکہ والد کی محبت سے محروم رہی تھی اس وجہ سے وہ اس باپ بیٹی کی محبت کو صحیح تناظر میں سمجھ نہیں پاتی اور رائے صاحب سے عشق کا اظہار کر بیٹھتی ہے۔ اور پشیمانی اٹھاتی ہے۔ جلد ہی رائے صاحب کا انتقال ہو گیا اور بات ختم ہو گئی اس بات کا شمن پر بہت گہرا اثر ہوا۔ ایک تو وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو گئی اور دوسرے زبردست بیمار پڑی۔ اس بیماری کے دوران اسے اپنے گھر والوں سے اور بھی نفرت ہو جاتی ہے گھر کے متعلق اس کا تجربہ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اور بھی زیادہ تلخ ہو جاتا ہے۔ بیماری کی وجہ سے وہ نہایت چڑچڑی اور بد مزاج ہو گئی تھی تبھی اعجاز اس کے گھر میں قدم رکھتا ہے اس بار وہ پرانا دالا "ابو" نہیں تھا بلکہ وہ ایک خوب رو اور بڑھا لکھا جوان تھا۔ جواب دوسروں کا بات پر مذاق اڑاتا اور شمن کو چھیڑتا۔ ایک بار پھر سارا گھر اپنی اپنی لڑکیوں کے ساتھ اسے بھنسانے کیلئے مستعد نظر آتا ہے۔ مگر اعجاز شمن کی دوست بلقیس سے شادی کا خواہشمند ہے اس کام کے لئے وہ شمن سے سفارش کر دانا چاہتا ہے۔ شمن حالانکہ اعجاز کو پسند نہیں کرتی تھی مگر شاید وہ اسے غیر شعوری طور پر پسند کرتی تھی اسی وجہ سے یہ سن کر اسے بے انتہا افسوس اور صدمہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی دوست بلقیس کو پسند کرتا ہے شمن نے اس سلسلے میں اس کی مدد نہیں کی بعد میں جب اعجاز سے شمن کی شادی کی بات چلی تو شمن نے اس سے شادی سے انکار کر کے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے لیا۔

شمن کی دوست ایلا جو "باغی" خیالات کی تھی اسے لڑکیوں سے زیادہ لڑکوں سے دوستی کرنے میں مزہ آتا۔ وہ "عیسائی" ہوتے ہوئے بھی کرشن جی کی پجاریں تھی اپنے باغی خیالات کی وجہ سے ہی اسے اسکول سے نکال دئے جانے کی دھمکی دی جا چکی تھی۔ کالج میں آنے کے بعد اس کی دنیا ہی بدل گئی اب اسے معلوم ہوا کہ دنیا کتنی بڑی

ہے۔ ایسا سے شمن کی دوستی گہری ہو گئی اور اس کے کھلے خیالات سے شمن نے کافی کچھ سیکھ لیا تھا۔ اب وہ پہلی والی شمن نہ رہی تھی وہ خود اپنے آپ کو پہچاننے میں دقت محسوس کرتی۔ کالج میں داخلہ اس کی زندگی کا اہم موڑ ہے۔ اس کی ملاقات کالج کے پریسیڈنٹ افتخار سے ہوتی ہے اور یونین کے لوگ بھی جیسے سیتل مس بگ کا بھی اسے کم متاثر نہیں کرتے بعد میں شمن بھی کالج یونین کی ممبر بن جاتی ہے اور اسی دوران افتخار سے اس کا گہرا تعلق ہو جاتا ہے۔

شمن کا
افتخار سے
تعلق

نوری کی شادی طے ہونے کی خبر ملنے پر شمن اپنے گھر چلی جاتی ہے۔ نوری کو مایوں میں بیٹھا دیکھ کر اسے عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔

نوری کی
شادی

شادی کے دوران اس نے بڑے بزرگوں کے خیالات کا خوب مذاق اڑایا اسے مہر کی رقم ایسی معلوم ہوئی جیسے کسی نے نوری کی جوائی کا سودا "اکیاد ہزار" میں کر لیا ہو۔ اسی دوران اس نے ایک ایک رسم کو ایک ایک بات کو بڑے غور سے دیکھا اور اس کے بارے میں گہرائی سے سوچا۔ پہلے اسے شادی سوئے بازی معلوم ہوئی۔ مگر جب نوری رخصت ہونے لگی تو اس کے خیالات ایک دم بدل گئے معلوم ہوتا تھا یہ شادی سو دے بازی نہیں بلکہ محبت کا ایک پاک رشتہ ہے جس کو گھر والوں کے سامنے اقرار کر لیا ہو اور ساری زندگی خوش رکھنے کا وعدہ کر کے دولہا نوری کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہو۔

شادی کے بعد نوری کو سولے اپنے شوہر کی شرارتوں کے بیان کے کسی اور چیز سے دلچسپی ہی نہ رہ گئی تھی۔ اُدھر افتخار "دق" کا مرض بڑھ جانے کی وجہ سے بھوانی علاج کے لئے جلا گیا تھا۔ اب افتخار کی جگہ سیتل نے لے لی تھی اور شمن ایک بیدار ذہن عورت کی طرح یونین میں کام کرتی رہی۔ ترقی پسند تو یہ لوگ تھے ہی اب اشتراکی بھی ہو گئے۔ ملک کی آزادی کے لئے کھادی پہننا ضروری سمجھا جاتا تھا لہذا ان لوگوں نے بھی کھادی پہننا شروع کر دیا اسی دوران معلوم ہوتا ہے کہ روشن خیال "ایلا" سیتل کے بچے کی ماں بننے والی ہے لیکن عجیب و غریب ایلا سیتل سے شادی نہیں کرنا چاہتی اس لئے اس کے بچے کا اسقاط کر دلنے کے لئے کسی دوسرے شہر چلی جاتی ہے۔

افتخار
سیتل

تعلیم مکمل کرنے کے بعد شمن شاد نے زمانے کی افراط فری دیکھنے ہوئے ایک قومی اسکول کی سرپرستی قبول کر لی۔ مگر قومی اسکول کا تو حال ہی برا تھا۔ ایک رئیس نے عمارت خیرات

میں دیدی دوسرے نے اپنی تمام کتابیں جو بالکل بے کار تھیں دیدیں۔ پڑھنے والی لڑکیاں جن کا نام رجسٹر میں درج تھا شاید وہ پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں۔ استانیوں کے حال بدتر تھے انہیں بیس روپے دیکرتیس روپیہ وصولی کے کاغذ پر دستخط لئے جاتے اور رسید لی جاتی دو چہرہ اسٹیں تھیں۔ جو ایک زمانے میں طوائفوں کی نائیکہ رہ چکی تھیں۔ ایک چہرہ اسی تھا جو نیچر صاحب کا سیرا۔ باورچی۔ فرانس اور بچوں کی گورنس کی خدمات انجام دیتا۔ قومی اسکول کا حال قوم کی طرح ڈھیلہ ڈھالا تھا۔ یہاں نہ پڑھائی ہوتی نہ قاعدے قانون سیکھائے جاتے تھیں ابھی قومی اسکول کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ ایک روز افتخار نے آکر اسے حیرت میں ڈال دیا معلوم ہوا کہ وہ جیل میں تھا۔

افتخار
پس

شمن قومی اسکول کی نوکری کے دوران اس قدر پریشان ہوئی کہ کچھ دنوں کی چھٹی لے کر آرام کے ارادہ سے گھر سے نکل پڑی مگر وہ اپنی منزل نہ ملے کر پارہی تھی۔ اسی دوران اس کو ایلما اسٹیشن پر مل گئی۔ دو پرانی سہیلیوں نے آپس میں مل کر اپنے دکھ درد کہہ سنائے معلوم ہوا ایلما نے نہ چاہتے ہوئے سیتل کے بچہ کو جنم دیا ہے اور مجبوراً پال رہی ہے مگر دنوں میں بالکل نہیں بنتی۔ اور بیٹا بالکل متضاد مزاج کا مالک ہے وہ نفرت جو ایلما کو سیتل سے ہو گئی تھی اس کا انتقام وہ اپنے بیٹے ”رولف“ سے لیتی ہے اسے بات بات پر مارتی اس کی باتیں سنتی اور نفرت کرتی شمن نے کچھ ہی دنوں میں ماں بیٹے کے درمیان کا فاصلہ کم کر لیا اور واپس اپنے اسکول آ گئی۔ مگر اسکول کی بوسیدہ فضا سے جلد ہی دل گھرانے لگا۔ اسی گھبراہٹ اور اکیلے پن کو دور کرنے کے لئے اس نے کلب جانا شروع کر دیا وہیں اس کی ملاقات منظور صاحب سے ہوتی ہے۔ یہ ایک رئیس آدمی تھے۔ دل میں قوم کی خدمت کا جذبہ رکھتے تھے۔ انہی کے ساتھ شمن گاؤں سدھارنے کے لئے جانے لگی۔ نام تو ضرور سملج کی خدمت کا تھا مگر ہوتی یہ پکنک ہی تھی۔ اسی طرح وقت گزرتا رہا کہ ایک روز افتخار کا نار ملا ”آن ملو“ اور وہ ”بھوانی“ چلی گئی۔ اس بچہ وہ افتخار کے علاج کے لئے روپے بھیجتی رہی تھی وہ اس کے لئے سوٹر اور حلوہ بنا کر لے گئی گویا شمن اور افتخار میں ایک غیر شعوری عشق پر دان جڑھا رہا تھا واپس آنے پر ایلما نے اسے اپنے پاس کچھ روز کے لئے بلالیا تبھی معلوم ہوا کہ ایلما کی دماغی حالت ٹھیک نہیں اور رولف کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس دوران وہ ایلما کو بار بار شادی

کرنے کے لئے تیار کرتی مگر وہ راضی نہیں ہوتی۔ واپس آنے کے بعد زمانے کی رفتار بھاگتی
ہوئی ریل طرح بڑھی جا رہی تھی کہ یکایک حسین بی نام کی ایک عورت نے آکر اسے آسمان
 سے زمین پر پٹک دیا جب اسے معلوم ہوا کہ وہ افتخار کی بیوی ہے اور افتخار کا تعلق صرف
 دشمن سے ہی نہیں بلکہ کئی لڑکیوں، عورتوں اور طوائفوں سے بھی ہے حسین بی
 دشمن کا خط دکھا کر اسے بلیک میل بھی کرتی ہے دشمن اندر سے ٹوٹ جاتی ہے پھر جاتی
 ہے اور جلد ہی اپنے آپ میں ایک تبدیلی لاتی ہے وہ کسی ایک کی نہ رہ کر سب میں تقسیم
 ہو جانا چاہتی ہے یہ سٹہ بازی اس نے پروفیسر رحمان کامریڈ، انقلابی شاہ بھی کے
 ساتھ شروع کر دی۔ مگر چند برسوں میں اس سے بھی جی بھر گیا تو ایک بار پھر دشمن نے اپنی
 نسوانیت کی خاطر یہ طے کیا کہ وہ خاندان کے کسی بچہ کو گود لے کر پالے گی۔ مگر کہتے ہیں کہ بچہ
 جسے بغیر کوئی عورت ماں نہیں بن سکتی اس طرح دشمن نے ہزار چاہا کہ کسی بچی کو گود لے لے
 مگر ناکام آخر کار اس نے منجھو بی کی ایک لڑکی کو گود لیا لیکن وہ انتقال کر گئی دشمن اسی
 شرمندہ ہوئی کہ دوبارہ اس نے کسی بچے کی طرف نہ دیکھا۔ کیونکہ اب اسے معلوم ہو گیا تھا
 کہ محبت اور ممتا خریدی نہیں جاسکتی۔

اور ایک بار پھر وہ اپنے اکیلے وجود کو لیکر ایما سے ملتی ہے اور وہیں ہر اسکی ملاقات
رونی ٹیلر سے ہوتی ہے جو انگریز فوج میں افسر تھا۔ یہ انگریز نہیں بلکہ "آئرش" دشمن
 کو گوری چٹری سے بہت نفرت تھی مگر محبت کے آگے اسے جھکنا پڑا اور جلد ہی وہ دونوں نے
 شادی کر لی۔ مگر نفرت کا جذبہ جلد ہی پھوٹ نکلتا ہے، پہلے ہلکی پھلکی لڑائیاں پھر کالی گلوچ
 اور پھر لمبی چوڑی لڑائیاں ہونے لگتی ہیں۔ اور چند مہینوں میں لڑائی سے تنگ آکر رونی ٹیلر
 محاذ پر چلا جاتا ہے اور دشمن پھر اکیلی تنہا رہ جاتی ہے۔ مگر تبھی ڈاکٹر اسے یہ بتاتا ہے کہ وہ ماں
 بننے والی ہے اور اس احساس کے ساتھ ہی یہ ناول ختم ہو جاتا ہے۔

یہ تھا "ٹیلرھی لکیر" کا سیدھا سا قصہ جو عصمت نے اپنے ناول میں بڑی خوبی سے
 دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے، ناول کی بنیاد اس کے قصہ بن پر قائم رہتی ہے لیکن
 اس کا آغاز اور اختتام کسی خاص اصول یا ضابطے کا پابند نہیں ہوتا۔ عصمت نے اپنے
 ناول میں قصے کو فلیش بیک یا شعور کی رو کی تکنیک سے بچا کر بظاہر سیدھے
 سادے انداز میں پیش کیا ہے یعنی ناول دشمن کی پیدائش کے بیان سے شروع ہوتا ہے

پھر بچپن اور نوجوانی کی منزلوں سے گزر کر اس کی شادی اور شادی کے واقعات کو ہمیشہ ہوا ایک نازک اور اہم موڑ پر ختم ہو جاتا ہے ناول میں شمن کا قصہ بیان کیا گیا ہے اور ایک بہترین اور کامیاب فلم کار کی طرح عصمت چغتائی نے شمن کے قصے میں تمام واقعات کو باہم مربوط کرنے والی ڈوری کو اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اسے کہیں بھی الجھنے کٹنے یا ٹوٹنے نہیں دیا۔ غالباً اس لئے ڈاکٹر ہارون ایوب نے "ٹیڑھی لکیر" کے پلاٹ پر اظہار خیال کرتے ہوئے اسے روایتی قرار دیا ہے جو صحیح ہے اپنی کتاب "اردو ناول پریم چند کے بعد" میں لکھتے ہیں۔

نادر اور لعل
لعل کی سب سے بڑی بات
نادر کی سب سے بڑی بات
نادر کی سب سے بڑی بات
نادر کی سب سے بڑی بات

— "ناول کا پلاٹ کسی حد تک روایتی ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ ہیر و
کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے کہانی کی ہیر و شمن کی زندگی میں پیش آنے والے
واقعات کے سہارے ترتیب دی گئی ہے۔ جہاں اس کی زندگی میں کئی بڑے
ہی نہیں آئے بلکہ ایک ضعیف العمر رائے صاحب بھی شمن کی زندگی میں آتے
ہیں اگرچہ ان کا جلد ہارٹ فیل ہو جاتا ہے مگر وہ شمن میں احساس کمتری پیدا کر چکے
ہوتے ہیں، دراصل شمن بچپن ہی سے محرومی کا شکار ہی ہے۔۔۔۔۔ ناول کا
پلاٹ بہت سلجھا ہوا ہے اور اپنے اندر بہت معنویت رکھتا ہے عصمت
چغتائی نے شمن کے بچپن کے حالات پر بہت زور دیا ہے۔ اور یہ بات ثابت
کر دی ہے کہ بچہ سب کچھ اپنے ماحول سے سیکھتا ہے۔"

کسی بھی کامیاب ناول میں تجسس کی اپنی اہمیت ہوا کرتی ہے۔ ٹیڑھی لکیر میں شروع سے آخر تک
تک ہمیں تجسس برقرار نظر آتا ہے کہ اچھا اب کیا ہوگا شمن کی پیدائش سے لے کر ماں بننے تک
تک میں کئی مقام ایسے آتے ہیں جہاں اس کے بارے میں مزید جاننے کی خواہش قاری
کے ذہن میں تجسس پیدا کر دیتی ہے۔ شمن کی عجیب و غریب حرکتیں۔ ایما کی بے چینی۔ مس بوگا
کا کردار۔ افتخار سے شمن کا رشتہ۔ بلقیس کی عجیب و غریب حرکتیں اور اعجاز کی دوبارہ آمد۔ عباس
کا کردار۔ چچا کی خاموشی۔ رونی ٹیلر سے محبت اور آخر میں ٹیلر کا لڑائی پر چلے جانا جگہ جگہ پڑا اب کیا ہوگا
یہ سوال دماغ میں گھلبلا رہتا ہے، اور ہم اس کا انجام جاننے کیلئے بچپن ہوتے رہتے ہیں
یہی ایک اچھے پلاٹ کی کامیابی ہے بقول ڈاکٹر احسن فاروقی

”قصہ میں انتظار یا تجسس کی غلش خاص چیز ہے اور جتنی زیادہ انتظار کی غلش ہوگی اتنا ہی دلچسپ قصہ ہوگا۔ دنیا کی سب سے اعلیٰ قصہ گو الف لیلہ کی شہزادی شہزادہ گزری ہے۔“

واقعہ نظر ٹیڑھی لکیر کی مصنفہ واقعہ نگاری کا اچھا سلیقہ رکھتی ہیں۔ اس فن پران کی گرفت خاصی مضبوط نظر آتی ہے۔ واقعات کے تال میل کے معاملے میں بھی وہ اپنی بہترین صلاحیتوں کا اظہار کرتی ہیں کیوں کہ ٹیڑھی لکیر میں بیان کردہ واقعات باہم مربوط دکھائی دیتے ہیں اور قدم بہ قدم قصے کو آگے بڑھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ دراصل یہ خوبی پلاٹ کی بہترین تنظیم کے بغیر ممکن نہیں عصمت جغتائی قابل رشک تخلیقی ذہن رکھنے والی باشندہ ناول نگار ہیں ٹیڑھی لکیر کی پلاٹ سازی میں انہوں نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے خوب کام لیا ہے جس کے نتیجے میں ٹیڑھی لکیر کا پلاٹ بے حد گٹھا ہوا اور جاندار دکھائی دیتا ہے اس میں کہیں بھی بے ربطی نہیں ملتی۔ ناول کے کرداروں اور ان کے طریق زندگی میں نفسیاتی ابھینیں مزور نظر آتی ہیں لیکن پلاٹ یقیناً کسی بھی قسم کی ابھینوں کا شکار نہیں ہوتا عصمت کے تخلیقی ذہن نے ناول کے پلاٹ کو جو شکل عطا کی ہے اس میں بڑی قطعیت اور فن کاری ملتی ہے ٹیڑھی لکیر کے پلاٹ کو ہر طور گٹھے ہوئے پلاٹ کے زمرے ہی میں شمار کیا جائے گا۔

ٹیڑھی لکیر کے اختتام پر کچھ نقادوں نے اعتراض کیا ہے لیکن ہمارے تئیں اس ناول کا اختتام نہایت عمدہ ہے کیونکہ قاری میں ایک طرح کی بے چینی چھوڑ کر کہ شمن نے بچہ پیدا کیا ہو گا یا نہیں؟ ناول ختم ہو جاتا ہے۔

اسلم آزاد اس ناول کے پلاٹ کو تنہ دار اور معنی خیز بتاتے ہیں وہ لکھتے ہیں ”ہندی میں پلاٹ کچھ ڈھیلا ڈھالا سا ہے مگر ٹیڑھی لکیر اور معصوم کے پلاٹ میں جامعیت ہے۔ بالخصوص ٹیڑھی لکیر کا پلاٹ سیدھا سادہ اور اکہرا نہ ہونے کی وجہ سے وہ دقیق ہو گیا ہے۔ اس کے پلاٹ میں تہہ داری اور بڑی معنی خیزی ہے۔“

بہ لحاظ مجموعی عصمت چغتائی کا ناول ٹیڑھی لکیر خود ان کا ہی نہیں بلکہ اردو ادب کا ایک شاہ کار
 ناول ہے اور اپنی گونا گوں خصوصیات کے باعث اسے مدتوں یاد رکھا جائے گا۔
 قصے کا ربط و ضبط اور پلاٹ کی فن کارانہ تنظیم اس ناول کی ایسی خوبیاں ہیں جنہیں
 ادب کا کوئی نقاد نظر انداز نہیں کر سکتا۔ دراصل ان خوبیوں نے ہی اسے ایک شاہ کار بننے
 میں مدد دی ہے یہی وجہ ہے کہ کشن پرشاد کو ل جیسے بزرگ نقاد نے بھی (جو نئے ادب
 کے بڑے نکتہ چیں سمجھے جاتے ہیں) اپنی کتاب ”نیا ادب“ میں ٹیڑھی لکیر کا ذکر پریم چند
 کے ناول ”گودان“ کے ساتھ کرتے ہوئے اسے عصمت چغتائی کا شاہ کار قرار دیا ہے۔

پیڑھی لکیریں کردار نگاری

کردار نگاری

کردار نگاری ناول کا اہم ترین عنصر ہے۔ نذیر احمد کے ناول سے لے کر عبداللہ حسین کے ناول "باگھ" تک اردو کے تمام اہم ترین ناولوں میں کردار نگاری پر خاصا زور ملتا ہے۔ "فسانہ آزاد" کے ^(۱) میاں آزاد اور خود جی ^(۲) توبہ النصوح ^(۳) مرزا نواز ہندو بیگ اور کلیم ^(۴) امراؤ جان ادا کی مرکزی کردار امراؤ جان، خانم، بسم اللہ اور گوہر مرزا گودان کے ہو رہی، دھنیا اور گوہر ^(۵) آگ کا دریا کے گوتم نیلبر چچا اور کمال ^(۶) اداس نسلیں کے نعیم "لہو کے پھول" کے راحت رسول وغیرہ اردو ناول کے چند ایسے اہم کردار ہیں جنہیں آسانی سے فراموش نہیں کیا جاسکتا اور اپنی گونا گوں خصوصیات کے باعث ہمیشہ یاد رکھے جاتے گئے۔

جدید ناول نگاری کا فن کردار نگاری کے پرانے فارمولے کا قائل نہیں۔ اردو ناول میں اس نئے طرز کے اہم کردار کو ناول کی جان کہا جاتا ہے اور اس کی پیش کش کے معانی میں ناول نگار خصوصی توجہ صرف کرتا ہے تاکہ ان کرداروں کے ذریعہ وہ اپنی زندگی کے تجربات اور خود اپنی ذات کا اظہار کر سکے۔ ای۔ ایم فارٹرنے کرداروں کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔

"ہم کرداروں کو سپاٹ FLATE اور تہدار

ROUND میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ سپاٹ کرداروں کو تہریں

صدی میں مزاحیہ کہا جاتا تھا اور اب اسے مثالی کردار یا کردار کی

بگڑی ہوئی شکل کہا جاتا ہے۔ اس کی اصلی شکل کی تعمیر کسی واحد

خیال یا وصف کے گرد ہوتی ہے۔ اگر ایسے کردار میں ایک سے زیادہ پہلو نکلنے لگیں تو وہ تہدار کی تعریف کی طرف رخ کرتے ہوئے ہیں۔ کسی تہہ دار کردار کو جانچنے کا معیار یہ ہے کہ وہ موثر انداز سے متحیر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے کہ نہیں؛ اگر وہ کبھی صبر سے واستعجاب کا باعث نہیں بنتا تو وہ سپاٹ کردار ہے اگر وہ قائل کرنے کی صلاحیت سے عاری ہے تو وہ تہہ دار ہونے کا دھوکا دینے والا سپاٹ کردار ہے۔ وہ اپنے گرد بکھری ہوئی زندگی یعنی کتاب کے اوراق میں بند زندگی کو شمار کرنے کی صلاحیت سے عاری ہے۔“ ۱

یہ بات تسلیم کر لینے کے بعد کہ کردار دو طرح کے ہوتے ہیں اور ساری کہانی کے قصبے انہی کے ارد گرد گھومتے رہتے ہیں۔ کردار اپنے معاشرے کی اپنے طبقے کی اپنے رتبہ بہن بات چیت، لب و لہجہ کی اور ساتھ ہی رسم و رواج کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ اور سبھی ایک کردار اچھا کب بن جاتا ہے اس بارے میں سہیل بخاری کا خیال درست معلوم ہوتا ہے۔

”کردار نگاری کی شرط یہ ہے کہ قاری ناول کے کرداروں سے کوئی اجنبیت محسوس نہ کر جائے۔ وہ ہم جیسے گوشت پوست کے چلتے پھرتے انسانوں کے نمونے ہوں اور ان میں ہماری ہی طرح خوبیاں اور غلیبا ہوں۔ ناول نگار کرداروں کو اپنی تخیلیت کی مدد سے ایک مثالی نمونہ بنا کر پیش کرتا ہے۔ چنانچہ جو صفت اور خصوصیت ہم میں معمول حد تک پائی جاتی ہے وہ ان میں بدرجہ اتم ملتی ہے اس کے علاوہ جتنی خصوصیات بہت سے آدمیوں میں فرداً فرداً نظر آتی ہیں

خوب

وہ سب کی سب ایک ہی گردان میں مجتمع ہو جاتی ہے۔ ایک کردار سے مختلف انسانوں کو جو ہمردی ہو جاتی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ ان سے ہر ایک اپنی اپنی ذات کا کچھ نہ کچھ حصہ اس میں پالیتا ہے۔ ط

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک اچھے کردار میں چند خصوصیات ہونی ضروری ہیں یعنی وہ کہانی کے حادثات سے متاثر ہو اور انسانی کمزوریاں و خوبیاں دونوں موجود ہوں اور قاری پڑھتے وقت اس کردار کو اس حد تک پہنچانے جتنا کہ وہ اپنے کسی رشتہ دار کو بھی نہیں جانتا۔ "ٹیڑھی بیکر" میں قاری کے سامنے یکے بعد دیگرے بہت سے کردار آتے ہیں۔ ان میں سے چند اس کے ذہن پر گہرے اور دیر پا نقوش چھوڑتے ہیں اور چند خود بخود اس کے ذہن کے دھندلوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ "ٹیڑھی بیکر" کو بیشتر ناقدین نے کرداری ناول تسلیم کیا ہے۔ اس کے کرداروں میں شمن، بڑی آپا، منجھو بی، رائے صاحب، افتخار، رونی ٹیلر، ایما، رسول فاطمہ، نجمہ، لوزی، آجوا اور گدن وغیرہ ایسے کردار ہیں جو اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے قاری کو متاثر کرتے ہیں اور ناول میں بھی اپنا اہم رول ادا کرتے ہیں عصمت چغتائی کا شاہکار "ٹیڑھی بیکر" ایک کرداری ناول ہے جیسا کہ امراد جان ادا یا پھر پریم چند کا نرملہ ہے۔ مگر یہ ناول مذکورہ دونوں ناولوں سے تھوڑا مختلف ہے۔ کیوں کہ اس کی ہیروئن شمن کے پیدا ہونے سے لے کر اس کی شادی ہو جانے کے بعد تک کی کہانی ہے۔ اس کردار کو قاری ایسا جانتا ہے جیسے کوئی اپنے بچے کو وہ اس کی ایک ایک عادت، حرکت، خیالات، ضد، غمہ اور حد تو یہ ہے کہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی خواہش اور پسند ناپسند کو بھی جانتا ہے۔

شمن سب سے پہلے ایک ضدی لڑکی کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ اس کے اندر ضد کا زبردست مادہ ہے اور اسی ضد کی وجہ سے نہایت غصہ ور اور جذباتی ہو جاتی ہے اسے کسی کی نا انصافی پسند نہیں آتی۔ اس لئے وہ ان سے بدلا لینا چاہتا ہے اسے ہر غلط بات پر غصہ آتا ہے۔ منجھو بی سے مار کھانے کے بعد آپا سے ذیل ہونے یا پھر کیاری سے دھنیا توڑ لینے کے بعد وہ ہمیشہ غصہ سے پاگل ہو جاتی ہے۔ خوب ارقی ہے تو میسٹی گھنسوٹی ہے اس کی ضد اور غصہ دونوں اس کے دماغ پر جنون کی طرح طاری ہو جاتے ہیں۔ چوں کہ وہ بہت

چھوٹی ہے۔ اس وجہ سے کسی انسان پر اس کا رعب نہیں پڑتا۔ وہ کسی کو مار نہیں پاتی اس لئے اکثر اپنی گڑیا، کیاری اور بستر کو ہی نوح کھسوٹ کر اپنے دل کا غبار نکال لیتی ہے۔

”دھڑ دھڑ اس نے گھونٹوں اور لاقوں کی بوچھاڑ کر دی دانتوں اور ناخنوں سے اس کے پرزے کر دیئے۔ گویا وہ اپنے کئی خوفناک دشمن سے لڑ رہی ہو۔“

”وہ دانتوں سے میلے کپڑے کھسوٹنے لگی۔ بدبودار پا جامے ٹری ہوئی بنیانیں اور بساندے کرتے وہ غصے میں ان سب کو نکل جانا مپا ہتی تھی۔“

شمن میں انتقام کا زبردست مادہ ہے کسی شخص نے اگر اس کے ساتھ نا انصافی کی ہے تو وہ اسے بخشتی نہیں۔ چاہے وہ شخص اس سے عمر میں کتنا ہی بڑا چھوٹا کیوں نہ ہو۔ اس نے کسی کو معاف کرنا نہیں سیکھا۔ یالیوں کہتے معاف کرنا اس کی فطرت میں ہی نہ تھا۔ بڑی آپا نے اپنی بیٹی توڑی سے اس کا مقابلہ کر اسے اکثر نرسل کیا۔ وہ اسے برداشت نہ کر سکی۔ اور ان کی کیاریاں برباد کر کے بدلا لیتی ہے کدنا کی دادی سے بھی بدلا لیتی ہے۔ اسی طرح ”کدن“ کو ہا ہار مار کر بھی مانتھا۔ اس نے اس کے ساتھ نڈ انصاف کی تو اس نے اس کی نا انصافی کا بدلا کامریڈ محمد، انقلابی شاعر کو محبت کے نام پر ترپا ترپا کر لیا۔ منجھو بی نے اسے پالا پوسا بڑا کیا۔ مگر اسے خوب مارا بھی۔ وقت بے وقت کی مار کا بدلا وہ تخیل میں منجھو بی سے لیا کرتی۔ غرض کہ اس نے معاف کرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔

”بڑی آپا کی کیاریاں! آنا فانا میں وہ بھوک شیری کی طرح ہری بھری کیاریوں پر پل پڑی۔“

۱	ٹیرھی لکیر	عصمت چغتائی	ص	۲۱
۲			”	۳۲
۳			”	۳۷

” پھر تخیل میں ہی منجھو بی کو پیٹنے لگی۔ دو تھپڑ گال پر مار کر اس کے
کپڑے اتار ڈالتی اور نہلاتے لگتی۔“ ط

اعجاز شمن بڑے بچپن کا منگتے جب ایک خوش وضع نوجوان بن کر واپس لوٹا
تو بجائے خوش ہونے کے وہ اور بھی کڑھ جاتی ہے اور انتہا تو تب ہوتی ہے جب وہ
بمقیس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ خود اپنے آپ سے بیگانہ محسوس کرتا ہے کہ آخر اسے کیا ہو
گیا۔ شاید یہ عمر کا تقاضا تھا۔ اس نے اپنے آپ سے پوچھا
”کیا اسے اجو سے محبت ہو چکی تھی؟“ ط

مگر اس کے باوجود انتقام کی آگ نے اس کے اندر اجو سے پرانی دشمنی اور نفرت
بھڑکادی۔ آخر میں پورا گھر اجو کو اپنا داماد بنانے کا خواہش مند تھا۔ شمن نے اجو سے
شادی کرنے سے انکار کر کے نہ صرف اپنی بے عزتی کا بدلہ لیا بلکہ اجو کو ذلیل بھی کیا۔
کہ دیکھو تم چاہے جتنے بھی اچھے اور دولت مند عزت دار بن جاؤ میری نظریں وہی حقیر
اور ذلیل رہو گے جیسے پہلے تھے۔ اس نے صاف صاف اس سے شادی کرنے سے
انکار کر دیا کہ وہ ”اعجاز کے علاوہ کسی بھی جانور سے شادی کر سکتی ہے“ اور اس طرح
وہ اعجاز کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ مار کر بدلہ لیتی ہے۔

شمن ایک ذہین لڑکی ہے۔ وہ ہر بات کو نئے انداز سے سوچتی ہے اور غور کرتی ہے۔
وہ کسی بات کو صرف اس لئے ماننے کو تیار نہیں کہ وہ بات کسی بڑے نے کہی ہے
بلکہ وہ ”کیوں“ کا سوال بار بار دہراتی ہے۔ حالانکہ اس ”کیوں“ پر اسے کسی بار لوگوں کی
جھڑکی اور ڈانٹ بھی سننی پڑی تھی۔ مگر اس کے باوجود اپنے آپ کو بدل نہ پائی۔ وہ ہر بات
کو نئے پیرائے سے سوچتی اور غور و فکر کرتی۔ جب اس کی بہن اس کو پڑھانے بیٹھتی ہے تو
شمن بے ساختہ پوچھ بیٹھتی ہے کہ ”ا“ (الف) سے انار کیسے ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ
الف تو لمبا ہوتا ہے اور انار گول۔ اسی طرح منجھو بی کی جب برات آئی اور سبھی لوگ دولہا

دیکھنے جانے لگے تو دشمن بھی جانے کی ضد کرتی ہے۔ جب کسی عورت نے اسے گود میں لے کر دولہا دکھایا تو اسے یقین ہی نہ آیا کہ آدمی دولہا کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نے سوال کیا مگر کسی نے تسلی بخش جواب نہ دیا۔ تبھی اس کا تیز دماغ یہ سوچنے لگتا ہے کہ لڑکے مہندی تو لگاتے نہیں۔ پھر سمجھو کہ دولہا نے کیوں لگائی۔ اسی طرح جب اس کے ماسٹر صاحب پڑھاتے وقت اس سے کہتے:

✓ "ایک پیسے کی دو نارنگیاں نوڈیڑھ روپے کی کتنی؟"

اول تو سرے سے یہ گلچڑھے ہی اس کی قسمت میں نہیں کھے کہ وہ ایک پیسے کی دو نارنگیاں خرید سکے۔ دوسرے زیادہ سے زیادہ دو پیسے کی نارنگیاں کافی ہوتیں بھلا ڈیڑھ روپے کی کون بھر گاڑی نارنگیاں خریدے گا سڑ نہیں جائیں گی ساری ساری۔"

حالانکہ بچپن کے یہ معصوم سوالات ماسٹر اور گھر والوں کی نظر میں حقیر تھے اور اسے اکثر "کوڑھ مغز" کا خطاب دیا جاتا۔ مگر ہر بات کو نئے پیرائے میں سوچنا کسی بات کو گہرائی سے خیال کرنا اور ہر بات کو سوالیہ نشان کے ساتھ دیکھنا اور سوچنا اس کی شخصیت کی ایک خوبی بن گئی تھی۔ وہ اس دنیا کے بارے میں، عورت کے بارے میں، مرد و عورت کے تعلق شادی بیاہ، مذہب، سبھی باتوں کو ایک نئے انداز سے سوچتی ہے۔ اس کے اندر غور و فکر کی بڑی صلاحیت ہے جو عام انسانوں میں نہیں پائی جاتی بلکہ اپنی بھانجی نوری کی شادی میں جب وہ گھر جاتی ہے اور نوری کو مایوں بیٹھا دیکھ وہ عورت اور شادی کے متعلق ایک نئے انداز سے سوچنے لگتی ہے اسے عورت بالکل چاٹ کی طرح لگ رہی تھی جس کو اچھا بنانے کے لئے طرح طرح کے خوشبودار مصالحے ڈالے جاتے ہیں اور خریدار کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے وہ سوچتی ہے دلہن کی یہ سب تیاری کیوں؟ یہ ابٹن یہ مہندی کس لئے کس کے لئے یہ سب تیاری ہوتی ہے۔

"عورت! کیا یہی تھی جو عورت کی مرغین قاب کی طرح بنا کر کل ایک

نئے مہمان کے سر د کی جانے والی تھی اسے نہلا دھلا کر عطر میں
بسایا جائے گا کہ اگر تھوڑی بہت بسا نہ ہو بھی تو معلوم نہ پڑے
ایسے ہی جیسے سڑے گلے آلو کی چاٹ بنانے والا تلخی چھپانے کے
لئے ڈھیر سے مصلکے چھڑک دیتا ہے بالکل اسی طرح ذہن کو
شیرے میں لتھیر کر دواہلہ کے حلق میں اتار دیا جائے۔" ط

مسلم عورتوں کے لئے اسلام میں پردے کا رواج ہے مگر عورتیں اس پردے کو عذاب سمجھنے
لگی ہیں۔ وہ نقاب تو دور چاند اور ڈھننے کی بھی خواہش مند نہیں۔ شمن اکثر سوچتی ہے کہ کیا
پردہ ہٹا کر عورت نے اپنے سر پر کاپڑی تو شمنیں ماریں۔ کیا عورت پردہ ہٹا کر آزاد ہے؟
اور وہ اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ عورت نے پردہ چھوڑ کر نقصان ہی اٹھایا ہے۔

"سچ تو ہے کتنے مزے سے پردے میں آنکھ پھولی جاسکتی ہے
جی چاہا جس سے چھپ گئے اور جی چاہا جسے دکھا دیا۔ بد صورت تو خاں
فائدہ میں رہتی ہوئی جسے ہلکی سی جھلک دکھا دی وہی حسین سمجھ بیٹھا
یہ تھوڑی کہ مقابل بیٹھے ہیں اور ہر عیب سامنے رکھا دل دکھا رہا ہے۔" ط

شمن عورت اور مرد کے مسئلہ کے بارے میں بہت کھلے خیالات رکھتی ہے۔ عام طور سے
یہ مانتا جاتا ہے کہ مرد ظالم ہوتے ہیں اور عورتیں مظلوم شادی میں کبھی بنی زبیرات سے لڑی
بھاری کپڑوں میں عورتوں کو دیکھ کر شمن کو عورت ظالم اور بیچارے مرد مظلوم نظر آنے لگے
عورتیں کیا واقعی مظلوم ہیں؟ جو آرام سے اپنے اپنے شوہروں کی محنت کی کمائی کو زبیرا کپڑوں
میں برباد کرتی ہیں عورت کو لوگ سیدھی سادی مظلوم گاتے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ شمن
بڑے فلسفیانہ انداز سے مرد عورت یعنی گائے بیل کے بارے میں سوچتی ہے گویا اس نے ایک
نئی تخلیق کی ہے۔

"کیا گائے سینگ نہیں مارتی۔ ویسے بیل بیچارہ زندگی میں زیادہ اُٹھتا

یہ کہو کہ بیل غریب کس کے سینے میں سینگ مارنے جاتا ہے
ہل کے بیل کو کب فرصت ملتی ہے کہ لوگوں سے مذاق کرنے جائے
لیکن یہ گائے! سوائے گھاس چبانے اور دودھ دینے کے
اور کیا کام کرتی ہے؟ ان کی بلا سے دودھ پھر ٹرے نے نہ پیا آدمی نے
کھیر بنا کر کھالی۔ نہ ہاتھ ہلانے کی ضرورت نہ پیر اور پھر بھی انسان
گائے کی پوجا کرتا ہے اور بیل کو پوچھتا بھی نہیں۔ ۱

بچپن میں شمن کو سبھی کوڑھ مغز "کہا کرتے تھے۔ مگر جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئی اس کا
مطالعہ وسیع ہوتا گیا۔ اسے مذہب، تاریخ، فلسفہ اور ادب سے خاصا لگاؤ رہا۔ جب
بھی اسے موقع ملتا وہ رامائن اور اعلیٰ مفکرین کی دیگر کتابوں میں غرق رہتی۔ اسے بات کر کے
وقت کاٹنے سے بہتر ادب کا مطالعہ لگتا تھا۔ اسکول میں چھٹی کے دن وہ انہی کتابوں کو
پڑھ کر گزارا کرتی۔

"خاموش کرسی پر لیٹ کر رامائن کا ترجمہ پڑھا کرتی۔" ۲

اور

"چند ہی دنوں میں اس نے ان گنت کتابیں پڑھ ڈالیں جن میں

ہے "جین ایرا" نے اسے حد سے زیادہ متاثر کیا۔

شیگور کی کہانیاں خصوصاً "کاسٹ آؤٹ" پڑھ کر تو سچ سچ

آنسو نکل پڑے۔ ہارڈی کی مشہور ناول "ٹیس" نے بھی اسے

ہلا کر رکھ دیا۔ مگر سب سے زیادہ جس چیز نے اس کی رگ رگ کو نچا

کر پست کر ڈالا بابر ن شیلے اور کٹس کی شاعری تھی۔" ۳

شمن ایک خود دار لڑکی بھی ہے وہ اپنے ساتھ ہونیوالی نا انصافیوں اور بے ایمانیوں کا

۱۔ لیٹھی بکیر عصمت چغتائی ص ۲۵۳

۲۔ " " " ۱۹۲

۳۔ " " " ۱۹۲-۱۹۳

ذکر کس سے نہیں کرتی۔ وہ سب کچھ برداشت کر جاتی ہے۔ بچپن میں اسے گھر میں والدین کا پیار نہ ملا۔ مگر کبھی بھی کسی سے اس نے اس کا ذکر تک نہ کیا۔ رشید نے محبت کے نام پر اس کی زندگی کے ساتھ کھلواڑ کیا۔ امتحان کرنے ایک لمبے عرصہ تک نہ صرف شمن کے بھوپن کا فائدہ اٹھایا۔ اس سے مالی مدد بھی لی اسے "اموشنل بلیک میل" بھی کیا۔ اس کے بعد امتحان کی بیوی نے اسے "بلیک میل" کیا اور اس کے سونے کے بندے اور کڑے اتروا کر لے گئی۔ اعجاز اور رشید (شمن کے بچپن کا منگیترا) نے شمن کی دوست بلقیس سے شادی کرنے کا ارادہ کیا اور اس کو بیچ میں ڈالنے کی کوشش کی۔ مگر یہ سب سننے کے بعد بھی شمن کی خود داری ہی تھی کہ اس نے زبان سے کبھی کسی کی شکایت نہ کی۔ حد تو یہ ہے کہ اپنی عزیز دوست ایما سے بھی کسی بات کا ذکر تک نہ کیا کبھی کسی سے شکوہ شکایت نہ کیا۔ یہ اس کی خود داری ہی تھی کہ سب ظلم و ستم وہ خاموشی سے اُٹرتی رہی۔

شمن کے اندر جہاں خود داری کا جذبہ تھا وہیں بے وفائی کا بھی۔ اپنے چاہنے والوں سے بچھڑ کر روتی نہیں بیمار نہیں پڑی۔ ٹریتی نہیں بلکہ صبر کر لیتی ہے۔ مجھ سے اسے بہت لگاؤ تھا۔ مگر منجھو بی کی شادی کے بعد وہ ایک دم بدل جاتی ہیں۔ ان کی بے رخی سے اکتا کر شمن نے انہیں بھولنے کی کوشش کی اور بھول بھی گئی۔ "میں چرن" سے اسے اپنے اسکول میں پڑھائی کے دوران کافی لگاؤ ہو گیا تھا۔ مگر اسکول سے جانے کے بعد وہ انہیں بھی بھول بیٹھی۔ رشید (بلقیس کا بھائی) شمن کو پڑھاتا تھا۔ اس سے وہ محبت بھی کرنے لگی تھی۔ مگر جب اسے معلوم ہوا کہ وہ انگلینڈ پڑھائی کی غرض سے چلا گیا ہے تو شمن نے دل کڑا کر کے بھولنے کی کوشش کی۔

"شمن کو ایسا معلوم ہوا جیسے فلم کی ریل چلتے چلتے بیچ میں لوٹ گئی اور ہال کی بجلیاں چمک سے روشن ہو گئیں۔" ط

اور

"منجھو بی کے یہاں سے واپس لوٹی تو ایسا محسوس ہوا گویا اسے ہمیشہ

" پریمیا کے ساتھ رہ کر اسے ہندو دھرم بہت مقدس معلوم ہونے لگا تھا "۔

" رائے صاحب میں اپنا دھرم بھی بدل دوں گی "۔

شمن بہرپل ایک نیا چولا پہن کر سامنے آتی ہے اور اس ناول میں بہر آنے والا کر دار شمن کے اندر کچھ نہ کچھ تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔ اور یہی ایک تہہ دار یعنی ROUND کر دار کی نشانی بھی ہے۔

کیوں کہ ایک ساتھ اس کا کر دار ابھر کر سامنے نہیں آتا بلکہ پیاز کے چھلکے کی طرح کی طرح تہہ دار بن کر سامنے آتا ہے۔ شمن کے کر دار میں محبت کا جذبہ بھی بہت ہے چونکہ بچپن سے وہ محبت سے محروم رہی ہے۔ اس لئے وہ بار بار دھوکا کھاتی ہے۔ اور کامیاب ہوتی ہے۔ اس کی زندگی میں کئی لڑکے آئے ہیں۔ وہ ہلکا بھلکا رومانس بھی کرتی ہے۔ مگر کامیاب نہیں ہوتی۔ حالانکہ رشید سے وہ متاثر تو ہوتی ہے مگر بہت جلدی یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

اعجاز کو اس نے بچپن سے ہی ناپسند کیا تھا۔ پر اس کی زندگی میں کامریڈ ختم۔ پروفیسر اور انقلابی شاعر کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔ اور پھر اس کی زندگی میں اس کی دوست کے والد رائے صاحب آتے ہیں۔ حالانکہ وہ عمر میں بہت بڑے تھے مگر ان کی شخصیت ان کی فوہی ان کی قابلیت ان کی باتوں سے متاثر ہوتی ہے۔ ان کی محبت کو وہ غلط سمجھتی ہے۔ اور اپنے عشق کا اظہار کرتے ہی ہے۔ رائے صاحب کا کر دار عصمت کے بلند تخیل، گہرے تجربات اور وسیع مطالعہ کی دین ہے۔

رائے صاحب سے شمن کی ملاقات اس ناول میں ہی نہیں بلکہ شمن کے کردار کے ارتقاء کے لئے بھی ضروری ہے۔ یہاں فرائڈ کے فلسفہ "الکسٹرا کامپلیکس" کی ایک مریضانہ مثال بھی ملتی ہے اور ایک معصوم لڑکی کے معصوم بھول بھی جس نے کبھی کسی بزرگ سے محبت کے چند کلمات بھی نہ سنے تھے۔ شمن کا یہ عشق اس کے مریضانہ اور بچے ذہن کی دین ہے اول تو اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ باپ بھی بیٹی کو چاہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ خود اس محبت اور شفقت سے محروم تھی۔ اس لئے رائے صاحب کی شفقتوں کو ٹھیک سے سمجھ نہیں پائی اور رائے صاحب سے محبت کا اظہار کر کے ایسا شرمندہ ہوئی کہ بیمار پڑ جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کی زندگی میں افتخار نام کا ایک لڑکا قدم رکھتا ہے۔ چوں کہ شمن کھلے دل و دماغ اور "فری نیچر" کی لڑکی تھی اور زندہ دلی کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ اور ایسا ایک شخص افتخار اسے ملتا ہے۔ وہ اس سے متاثر ہو جاتی ہے اور اس حد تک متاثر ہوتی ہے کہ نہ صرف مالی امداد کرتی ہے بلکہ اپنا خون اس کے جسم میں پہنچا کر دو جسم ایک جان بھی بن جانا چاہتی ہے۔ اس نے افتخار سے محبت کی اور دل و جان سے کی۔ مگر کامیابی یہاں بھی نصیب نہ ہوئی۔ بقول عزیز احمد

"عصمت کی ہیروئن کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ دل سے

نہ اسے کسی مرد نے چاہا اور نہ اس نے کسی مرد کو۔"

عزیز احمد کا یہ قول معقول نہیں لگتا کیوں کہ شمن نے افتخار سے جی جان اور روح سے محبت کی۔ اس کی بیماری میں مدد کی۔ دوا دارو، روپیوں پیسوں سبھی کچھ تو اس نے کیا۔ مگر جب مرد ہی بے وفا نکل جائے تو عورت کب تک محبت کر سکتی ہے۔ افتخار کی بیوی حسین بی کی آمد نے شمن کی آنکھ کھول دی۔ وہ اس محبت میں نا کام سیاب ہو کر روئی نہیں۔ اندر سے لڑتی نہیں بلکہ اس نے تلخ تجربے کیساتھ سمجھوتا کر لیا۔

افتخار کے بعد اس کی زندگی کا سب سے اہم مرد اس کا شوہر رونی ٹیلر آتا ہے جس نے شروع میں شمن کو خوب چاہا۔ مگر سمجھ نہ سکا۔ شروع میں چھوٹے چھوٹے جھگڑے

ہوئے پھر وہی جھگڑے بڑی بڑی لڑائیوں میں بدل گئے اور ایک روز دشمن پھر اسی
 رہ گئی۔ اس کے اندر محبت کا جذبہ تو بہت تھا مگر وہ اسے کسی کو نہیں دے پائی اور
 نہ ہی کسی نے اس کو پیار دیا۔ وہ محبت کی بھوک تھی۔ اور آخر تک وہ اس کی متلاشی رہی
 یہ اس کی ٹریجڈی بھی ہے۔

دشمن کو چھپوڑے عشق سے سخت نفرت ہے۔ محبت کے نام پر رونا بلکنا
 فیر یادیں کرنا ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرنالے پسند نہیں اس نے رشید کی محبت کو بھی
 محبت نہ سمجھا۔ یہی ماکہ بھائی زیندر کو وہ منہ نہ لگاتی۔ اور اس کی بھونڈی محبت
 کا مذاق اڑاتی ہے۔ امجاز کی چھپوڑی محبت کو وہ آخر تک بھول نہیں پائی۔ کامر ٹیپہ
 پر دھیس انقلابی شاعر اور انجینئر ان سبھی کو اس نے محبت کی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ
 وقت گزارنے کا ایک اچھا ذریعہ سمجھا۔ عباس کی حرکتوں کو اس نے کبھی اچھی نظروں
 سے نہیں دیکھا۔ اس کے دماغ میں محبت کا جو تصور تھا وہ اسے زندگی بھر نہ سلا
 نوکری کر لینے کے بد دشمن بہت بدل جاتی ہے۔ وہ اپنی نوکری
 کو ذمہ داری سے نبھاتی ہے۔ دشمن ایک ذمہ دار استانی، مضبوط ارادہ، بلند خیال اور
 اونچے نظریے کی معلمہ بن چکی تھی چولا کہ وہ ایک گرس اسکول کی نگراں تھی۔ اس لئے
 بھڑکدار کپڑا، زیور یا میکپ وغیرہ سے پرہیز کرتی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو مثالی
 بنا کر پیش کیا تھا۔

”ورنہ وہ تو کبھی کی ایک کامیاب معلمہ بن چکی ہوتی جس کے ربے دوسری استانیات
 لرز میں اور لڑکیاں کانپ اٹھتی۔“ ط

دشمن میں رحم دلی بھی موجود ہے۔ وہ دوسروں کے غم میں شریک ہوتی ہے۔
 ان کی خوشی میں خوشی محسوس کرتی ہے اور غم میں غمگین ہو جاتی ہے۔ وہ غریبوں اور
 محتاجوں کی مدد کرتی ہے اور ان کی بد حالی کو دور کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے۔ وہ اسکول
 میں نوکری کے دوران بہت سی غریب لڑکیوں کی فیس معاف کر داتی ہے۔ چیراسیوں

کی مالی مدد کرتا ہے اور غریب لوگوں کی اکثر مدد کرتی ہے۔
 ۱۰ اس نے دونوں چیراسنوں کو اپنے پاس سے دو دو روپے دینا شروع
 کئے جب کبھی ممکن ہوتا استانیوں کی دعوت کر دیتی۔ ہر ماہ دو چار غریب
 لڑکیوں کی فیس بھی ادا کر دیتی۔ ۱۱

اور

”گزشتہ چند ماہ میں اس نے افتخار کو کچھ رقم اور گرم کپڑے بھیجے
 تھے اور کچھ طاقت کی دوائیں بھی۔“ ۱۲

افتخار کو نہ صرف گرم کپڑے اور دوائیں بھیجتی ہے بلکہ جب اس سے ملنے اسپتال
 جاتی ہے اس وقت بھی رحم دلی کی وجہ سے اس کا بل ادا کر دیتی ہے اور چلتے وقت
 ۱۳ ”تو تنو کے چند لٹوٹ شمن نے لفافے میں ڈال کر میز پر سرکا دیئے۔“
 اس کی دوست ایلما جب سیٹل کے بچے کی ماں بننے والی تھی وہ اندر سے کوٹ چکی تھی اپنے
 ضمیر کو زخمی کر چکی تھی شمن نے بڑی ہمت سے اس کی دل جوئی کی اور اس کے بیٹے رولی
 سے اس کا میل بھی کرایا۔ نہ صرف اس نے ایلما کو مارل سپورٹ دیا بلکہ بچے کی پرورش
 میں بھی اس کی مدد کی وہ دور بیٹھی ایلما کو بچوں کی پرورش کے متعلق بحث ابیں بھیجا کرتی۔
 شمن کے اندر ایک خاص قسم کی بے عینی ہے، جستجو ہے، تڑپ ہے جو شروع
 سے آخر تک قائم رہتی ہے اور شاید اس لئے کیوں کہ وہ نئے اور پرانے دور کو ملانے
 کی کڑی ہے۔ اس کے کردار میں دو تہذیبیں ملتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ پرانی روایت سے
 پوری طرح انکار نہیں کر سکتی اور نئے خیالات کا پوری طرح خیر مقدم بھی نہیں کر سکتی۔ یہ کردار
 ۱۵ اسی لئے بے چین ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عصمت جس حد تک زندگی گزار چکی تھیں! یا ننداری سے

فریدی
افتخار

۱	یڈھی میکر	عصمت چغتائی۔	ص	۳۹۴
۲		”	”	۳۲۳
۳		”	”	۳۴۰

سان کر گئیں۔ شاید لطیف (ان کے شوہر) نے لکھا بھی ہے کہ جس زمانے میں یہ
 ٹیڑھی لکیر لکھ رہی تھیں اس وقت ان کے یہاں پہلی ولادت ہونے والی تھی اسی لئے
 ناول کا خاتمہ شمن کے ماں بننے کے احساس پر ہی ختم ہوتا ہے۔ یہ عصمت کا کمال ہے کہ
 جس حد تک زندگی گزار رہی ہے اسی کا بیان کیا ہے۔ آگے وہ کچھ نہ لکھ سکیں ٹیڑھ
 کے ساتھ شمن کی لڑائی شاید خود عصمت اور شاید لطیف کی لڑائی رہی ہو۔ ٹیڑھ
 کا گھر چھوڑ کر چلا جانا ہی اس ناول کا سب سے خوبصورت موڑ اور شمن کی زندگی کا سب سے
 اہم حصہ ہے۔ یعنی اب وہ کیا کریگی؟ اس جستجو کے ساتھ عصمت شمن کے کردار کو بھی ایک
 سوال ایک پہلی بنا کر چھوڑ دیتی ہیں۔ گویا چسپاڑھنے والا چاہے کردار کو اپنے سانچے میں
 ڈھال لے۔ کشن پرشاد کول کا یہ اعتراض کہ

”یہ شمن یعنی شمشاد ایک اچھے گھرانے کی تعلیم یافتہ آزاد خیال
 اور آزاد روشن لڑکی یعنی موڈرن گرل کی زندگی کی سیدھی سادی
 تصویر ہے۔ اس دن سے کہ جس دن وہ پیدا ہوئی اور جب تک
 کہ اس نے تھک کر شادی کر لی۔ گھر بار سنبھالا اور بچے جننے شروع
 کئے اس کی زندگی کی ایسی مکمل تصویر ہے کہ جس کا ہر فرد و خال مٹا
 نظر آتا ہے۔“

بابائے اردو عبدالحق نے اپنی لغت

THE STANDARD ENGLISH - URDU DICTIONARY کے صفحہ ۷۲۷ پر

MODERN کا مطلب یہ بتایا ہے۔ نئی روشنی کا شخص۔ جدید زمانے کا انسان۔
 چاہے یہ کہانی موڈرن گرل کی ہو یا پھر نہ ہو یہ ایک بہادر اور جانباز لڑکی کی داستان
 ضرور ہے جس نے معیبت عین آئینہ نہیں بہائے۔ جس نے کسی کے دل دکھانے پر شکرہ
 نہیں کیا۔ جس نے پڑھ لکھ کر اپنے لئے راستہ کا انتخاب کیا۔ اسے آپ موڈرن گرل کہتا
 چاہتے ہیں تو اچھی بات ہے ورنہ یہ ایک فرسین لڑکی ہے جس کی وہانت کو پہچانا نہ گیا اور

اور جس نے خود اپنی پہچان بنانے کی کوشش کی اس کی کہانی ہے۔
دوسری بات یہ کہ شادی تھک کر نہیں کی جاتی اور نہ ہی شمن نے کی بلکہ
شادی سماجی، مذہبی اور جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کی جاتی ہے۔ اور شمن نے
بھی اسی لئے شادی کی کشن پر شاد کول کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ

”نادول یہیں پر ختم ہو جاتا ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہئے تھا کیونکہ
موڈرن گرل کی واردات تو یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ قانون فطرت کا
منشا پورا ہو جانے کے بعد تو پھر شمشاد کی حیثیت وہی معمولی ہندوستانی
نسوانیت کی رہ جاتی ہے کہ جس میں عورت گھر بار سنبھالتی، بچے جنتی
اور ان کی پرورش میں لگی رہتی ہے۔ چونکہ شمشاد موڈرن گرل رہ چکی
ہے تو اسید کی جاتی ہے کہ اس نے بچے جننے میں احتیاط برتی ہوگی۔“

کشن پر شاد کا خیال کہ موڈرن گرل کو شادی سے لگاؤ ہوتا ہے مگر گھر گریہتی سے نہیں
کیوں کہ اگر وہ بچہ پیدا کرتی اور پالتی تو موڈرن گرل کیسے ہوتی۔ صحیح معلوم نہیں ہوتا
تھیوں کہ موڈرن گرل بچہ پیدا کرتے سے نہیں کتراتے بلکہ زیادہ بچہ پیدا کرنا
نہیں چاہتی جیسا کہ شمن کی ماں نے کیا۔ وہ بچہ کو پیدا کرنے کے بعد اس کا حق بھی دینا
چاہتی ہے۔ اس کی پرورش خود اپنے ہاتھوں سے کرنا چاہتی ہے تو جیسا کہ کشن پر شاد کا خیال
ہے کہ اس نے بچے جننے سے گریز کیا ہوگا۔ وزن دار معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ اس نے
بچہ کو پیدا کر کے باقاعدہ پرورش کی ہوگی اور اسے مکمل انسان بنایا ہوگا۔ یہ
قیاس آرائی کے علاوہ کچھ نہیں کہ شمن نے کیا کیا ہوگا اور کیا نہیں۔ کشن پر شاد کا خیال
کہ

”یہ بات دوسری ہے کہ یہ بھی بغیر کہے نہیں رہا جاسکتا کہ موڈرن
گرل کلبو تصویر ٹیڑھی بکیر میں ہمارے سامنے آتی ہے وہ مایوس کن ہے
نہ چہرہ مہرہ اور نقشہ ہی کچھ زیادہ اچھا ہے نہ لوک پلک ہی

درست ہے نہ خدوخال دیدہ زیب نہ لب و لہجہ شیریں۔“

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ عصمت ایک بہادر لڑکی کا ذکر کر رہی تھیں۔ ان کے سامنے کوئی ایسی مثال دستیاب نہ کی وہ نقل آتا میں بلکہ وہ اس کردار کو بنا رہی تھیں، تخلیق کر رہی تھیں۔ انہوں نے اس کردار کو ویسا بنایا جیسا وہ خود چاہتی تھیں۔ ان کے نزدیک جو آئیڈیل متاواہ لکھا۔ کشن کول صاحب کا یہ کہنا کہ ناول کی ہیروئن کے خدوخال نمایاں نہیں ہے، اس کی خوبصورتی کا بیان نہیں ہے۔ یہ بھی صحیح معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ عصمت چغتائی اس عورت کا ذکر کر رہی تھیں جس کے اندر خود اعتمادی، جدوجہد کا مادہ اور کچھ کر گزرنے کی صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ یہاں اس کے سراپائے حسن کا بیان مقصود نہیں۔

شمن کے کردار کے علاوہ جتنے بھی کردار اس ناول میں لائے گئے ہیں ویسے تو یہ سب ہی اپنی اپنی کہانی کہتے ہیں اپنے غم میں مبتلا اپنے ماحول سے متاثر نظر آتے ہیں مگر یہ سبھی کردار شمن کو بنانے اور بگاڑنے میں مدد دیتے ہیں چاہے وہ آیا ہو، مس چرن، سنجو، انا، افتخار، ایلمار، رائے صاحب، حسین ہی یا پھر اس شوہر ٹیپو کیوں نہ ہو۔ ان سبھی کرداروں نے یا تو شمن کے کردار کو بنایا ہے یا بگاڑا۔ شمن کا کردار بالکل پیاز کی طرح ہے۔ اس کا چھلکا اتارنا شروع کریں تو ہر تہہ کے بعد دوسری تہہ نکل آئے گی۔

شمن کے کردار کی

اگر ایک ایک گرہ کھولی جائے تو آخر میں کچھ نہیں بچتا۔ مگر مجموعی طور پر وہ یقیناً ایک کامیاب لڑکی کہی جاسکتی ہے۔ اور کشن پرشاد کا یہ خیال درست ہی معلوم ہوتا ہے۔
”امرواقعہ یہ ہے کہ عصمت نے ٹیپو ہی لیکر میں موڈرن گرل کی بنی ہوئی جیتی جاگتی اور بولتی چالقی تصویر کھینچی ہے اور بڑے سلیقے سے“ مل

لڑکی کے کردار کے ساتھ عصمت نے بوسیدہ رسم و رواج سے گھری روایتی لڑکی کے کردار کو بھی نہایت خاموشی سے پیش کیا ہے۔

”منجھو بی“ شمن کی منجھو بی جس نے اسے پالا پوسا اور بڑا کیا۔ والدہ نے سدا کر کچل (منجھو بی) اسے اتنا کے حال پر چھوڑ دیا تھا اور جب انا اپنی بد چلنی کی وجہ سے قابل نفرت ہو گئی اور اسے نکال دیا گیا تب اس ننھی سی لاوارث لڑکی کو منجھو بی نے سنبھالا۔ ناول کے شروع میں منجھو بی ایک محبتی بہن کے روپ میں سامنے آتی ہے

منجھو بی ایک محبت کرنے والی بہن ہے اور صفیہ اختر نے اسے ایک نا تجربے کار ماں کہا ہے جو درست بھی ہے۔ منجھو بی صبح سے شام تک شمن میں مگی رہتی۔ وہ اس کے لئے مٹی، فراہم سیتی اس پر کڑھائی کرتی اور شمن کو سجا بنا کر رکھتی۔ حالانکہ اس کو بچہ پالنے کا تجربہ نہیں ہے۔ مگر پھر بھی وہ مادرانہ شفقت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ شمن کو صاف رکھتی، کاجل سر نہ لگاتی اس کے لئے ٹوپیاں سیتی۔ غرض ایک ماں کا حق ادا کرتی۔

”منجھو نے اس کے لئے پھول جیسی فراہمیں اور ٹوپیاں سیں، گھڑی گھڑی ہنھلایا جا رہا ہے“ سرے ”کاجل اور مٹی سے لیں۔“

نہ صرف منجھو بی اس کے کپڑوں کا خیال رکھتی تھی بلکہ اس کی تعلیم کی طرف بھی توجہ دی۔ وہ چاہتی ہے کہ شمن ایک اچھی لڑکی نکلے۔ وہ اس کو بڑے پیار سے سمجھا کر پڑھاتی بھی ہے۔ اس کے لئے ”کتاب لاتی ہے اسے سیتی ہے“ اور پڑھانے بیٹھ جاتی ہے۔ وہ شمن کے بے تکے سوالوں کا جواب بہت پیار سے سمجھا کر دیتی ہے۔ منجھو شمن کو مارنے پٹنے کے بعد اسے اپنے سینے کی گرمی سے اس کے زخموں پر مرہم بھی لگاتی۔ اور اس لئے وہ منجھو کی مار کو بھی بڑے پیار سے سہہ لیتی ہے۔ منجھو صفائی پسند لڑکی ہے وہ جب دیکھتی ہے کہ شمن دھول مٹی میں کھیل رہی ہے تو اسے اکثر سمجھایا کرتی اور اس خراب عادت کو چھڑانے کے لئے وہ اسے مارتی۔ منجھو کی خواہش تھی کہ شمن صاف ستھرا کپڑا پہن کر اچھے بچوں کی طرح ایک جگہ بیٹھ کر کوئی شریف بچوں کا کھیل کھیلے۔ مگر وہ اس کی بات نہ مانتی اور دھول مٹی میں کھیلتی۔ جانوروں کے بازوؤں میں

جاتی اور نوکروں کے بچوں کے ساتھ کھیلتی رہتی۔
 منجھو ایک جلاؤ قسم کی لڑکی بھی ہے۔ اس کو غصہ بات بات پر آتا ہے اور شمن
 پر ٹوٹ کر برستی ہے۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات پر شمن کو بے انتہا مارتی ہے۔ اس کو
 اپنے غصہ پر قابو نہیں۔ چونکہ اسے بچہ پالنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ لہذا وہ یہ بات
 سمجھ ہی نہیں پاتی کہ چھوٹے بچوں کو کسی غلطی پر کتنا مارنا چاہئے اور کب سمجھانا چاہئے
 وہ شمن کو دھول سیٹی میں کھیلنے پر کپڑا گندا کرنے پر بالوں میں مٹی ڈالنے پر اور مٹی
 کھانے پر اسے خوب مارتی ہے وہ اپنا سارا غصہ ساری کھینچ اور سارا تباہ و شمن پر
 نکالتی۔ اور تب وہ ہمیں ایک جلاؤ اور ایک جذباتی لڑکی کے روپ میں نظر آتی ہے
 اس کی ساری اچھائیوں پر ایک لخت پر وہ پڑ جاتا ہے۔ یہ کہنا سبالتہ نہ ہو گا کہ
 وقت بے وقت کی مار ہی شمن کو ضدی اور بدتمیز بنا رہی تھی۔ وہ زبان کی سٹھاس سے
 زیادہ ہاتھوں کی مار کا استعمال کرتی۔ مگر اس میں منجھو کی بھی غلطی نظر نہیں آتی کیونکہ
 اس کے وحشیانہ برتاؤ اور بے وقت کی مار کو گھر کے کسی بڑے نے برا نہ مانا اور نہ ہی
 اسے لڑکا۔ اس طرح وہ سمجھ ہی نہ پاتی کہ ایک بچے کو اس کی معصوم غلطیوں کے لئے کس حد
 تک مارنا چاہئے۔ منجھو کو وحشیانہ مار غصہ و مزاج کی وجہ سے ایک بے رحم عورت کے
 روپ میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

”سب سے پہلا کام منجھو بی یہ کرتیں کہ گھونسوں، تھپڑوں اور
 چاٹوں سے جتنی دھول جھڑکتی جھاڑ دیتیں۔“

”مگر جب منجھو نے قاعدے کی صورت دیکھی تو تمام گزشتہ گھونسوں
 سے زیادہ وزنی گھونسا جھایا۔ اس کے بعد تھپڑ اور چاٹے۔ وہ دیر
 تک بیٹھی بے آنسوؤں کی سوکھی سوکھی سسکیاں بھرتی رہی۔“

منجھو بی کا کردار ایک دم سے تبدیل تب ہوتا ہے جب ان کی شادی ہوتی ہے۔ شادی سے پہلے وہ شمن کو اپنے پاس سلاتیں، اس سے باتیں کرتیں، اس کی باتیں سنتیں اور اس کو پیار کرتیں۔ مگر جیسے ہی منجھو بی کی شادی ہوتی ہے ان کی محبت پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ وہ جب پہلی مرتبہ ہی میکے آتیں ہیں تب بھی شمن کو بہت دیر میں یاد کرتی ہیں۔ مانا کہ شادی کے بعد بڑیاں بدل جاتی ہیں مگر اس بدلنے میں بھی وقت لگتا ہے مگر منجھو بی تو شادی ہونے کے ساتھ ہی اس سے ایسی بے رخی دکھاتی ہیں، ان کی محبت، شفقت، لاڈ اور نخرے سب ایک ہی جھٹکے میں ختم ہو جاتے ہیں۔ ان کے سامنے نوری شمن کو کھنگن، گندی اور چڑیل کہتی رہی مگر منجھو نے ذرا بھی خیال نہ کیا اپنے پاس سلانا تو دور وہ اس کو اپنے پاس بھی نہ بٹھاتیں۔ وہ بیٹھی گھٹول اپنے شوہر ساں اور سسرالیوں کا ذکر کیا کرتیں۔ مگر شمن کو پاس نہ پھٹکنے دیتیں۔ منجھو بی کا ایک دم سے بدل جان کے کردار کو انوکھا بنا دیتا ہے۔

اس کردار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے شمن کو پالا پوسلا اور اپنی ضد کی وجہ سے اسے بھی ضدی بنا دیا۔ شمن کے کردار کی کج روی منجھو بی کی وجہ سے ہی پیدا ہوتی ہے کیوں کہ ان کی ہمار اور کڑی ہدایت نے اسے ضدی اور باغی بنا دیا تھا جو آخر تک قائم رہی اور حد تو یہ ہے کہ اس کی شوہر سے بھی نہ پٹی۔ شمن کے کردار کو مکمل اور پختہ بنانے میں منجھو بی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

شمن کے کردار کو مکمل کرنے کے لئے منجھو بی کا کردار بہت ضروری ہے۔ یہی اس کردار کی خوبی ہے۔

”سنجھلی“ شمن کی بہن ہے اور عصمت چغتائی نے ٹیڑھی لکیر میں کئی بہنوں کا ذکر کیا ہے۔ آپابی، سنجھلی، سنجھلی اور شمن ان سبھی بہنوں کے کردار میں فرق ہے۔ ہر کردار اپنی انفرادیت اپنی عادت اپنے خاص مزاج کو لے کر سامنے آتا ہے۔ جس طرح ایک گھر میں کئی بہنیں ہوتی ہیں۔ مگر الگ الگ مزاج اور عادت کی۔ اسی طرح یہاں بھی بہن اپنی خوبی اور خانی کو لے کر سامنے آتی ہے۔

سنجھلی کا کردار نہایت خاموشی اور چپکے سے عصمت چغتائی نے پیش

کیا ہے۔ مسلم متوسط خاندان کی ایک سیدھی سادی لڑکی کی یہ ایک اچھی مثال ہے۔ جس طرح ایک عام لڑکی پیدا ہو کر چپ چاپ بغیر کسی کو پریشان کئے بڑی ہو جاتی ہے۔ اور شادی کے بعد بچے پیدا کرنا، کھانا بنانا ہی وہ اپنا کام اور ایمان سمجھتی ہے۔ سنبھلی کا کردار بالکل ایسا ہی ہے۔ نہ اس نے کبھی منہ کی اور نہ کبھی کسی چیز کی شکایت۔ خاموشی سے پیدا ہوئی، بلی، بڑھی اور موت کو گلے لگا لیا۔

”سنبھلی بچاری ان جانوروں میں سے تھی جو نہایت سلیقے سے پیدا ہوتی ہیں، شریفوں کی طرح گھر میں رہتی ہیں۔ پھر کوئی اللہ کانیک بندہ بیاہ لے گیا۔ وہاں جب تک جی میں طاقت رہی بچے پیدا کئے، پالے پوسے پھر کسی دائمی مرض میں مبتلا ہو کر دکھ سہتی رہیں اور ایک دن اللہ نے مٹی عزیز کر لی۔ سب کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ واہ کیا جنتی بیوی تھی۔“

حالانکہ اس کردار کے ہونے یا نہ ہونے سے اس ناول میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کیونکہ اس کا کردار بہت معمولی معلوم ہوتا ہے۔ مگر عصمت اس کردار میں ہندوستان کے مسلم خاندان کی ان ہزاروں کروڑوں بے زبان لڑکیوں کی داستان بیان کر دیتی ہیں جو نہ کسی دکھ کی شکایت کرتی ہیں اور نہ ہی شکوہ۔ بے زبان گائے کی طرح زندگی گزارتی ہیں۔ شمن کے کردار کو مضبوط بنانے میں اس کردار کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ مگر یہ خود اپنے آپ میں مکمل اور اچھا کردار ہے۔

”بڑی آیا“ شمن کی سب سے بڑی بہن جسے سب بڑی آپا کہہ کر پکارتے ہیں بڑی آپا نے اماں کی اتنی ساری لاڈلوں کو پالا پوسا تھا کہ جب شمن پیدا ہوئی اس وقت تک بچے پالتے پالتے ان کا دل بالکل بھر چکا تھا اور اسی لئے بڑی آپا نے شمن کی پیدائش پر کوئی خوشی کا اظہار نہیں کیا بلکہ اسے گالی دے کر فضول چیز قرار دیا۔ آپا کو شمن سے پیدائش بیرحمت جیسا کہ پرانے زمانے میں ہو کرتا تھا۔ والدین بچہ پیدا کرتے اور بڑی لڑکیاں پال پوس کر بڑا کرتیں۔ بڑی آپا نے بھی اماں کے کئی بچوں کو پالا تھا مگر شمن کو وہ محبت نہ دے سکی۔

بڑی اولاد ہونے کی وجہ سے والدین کی لاڈلی بھی تھیں اور اس پر سوتے پہ

سہا گایہ ہوا کہ وہ بھری جوانی میں بیوہ ہو گئیں اور مستقل یہیں رہنے لگیں۔ بڑی آپا کے بچے بھی تھے وہ ایک اچھی بہو بن کر سسرال میں رہیں۔ عام ساسوں کی طرح ان کی ساس بھی انہیں خوب طعنے دیتیں اور ان کو شوہر کے ساتھ نہ رہنے دیتیں۔ بڑی آپا خاموشی سے اپنی ساس کی جلی کٹی باتوں، طعنوں اور طنزیہ جملوں کو ایک خاموش بہو کی طرح برداشت کرتیں۔ ساس کو جواب دینا ان سے زبان بڑانا یا پھر ان کی کہی باتوں کو برا ماننا شاید آپا نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ حالانکہ شوہر کے ساتھ وقت گزارنے کی ان کی زبردست خواہش ہوتی۔ مگر وہ اپنی سادگی کی وجہ سے خاموش رہتیں۔ شوہر کی باتیں نہ مانتیں وہ روٹھ بھی جاتا۔ پھر بھی آپا اپنی ساس کی عزت کرتیں اور ان کے کہے پر چلتیں اور کبھی زبان سے شکایت نہ کرتیں۔ یقیناً وہ ایک اچھی ہندوستانی بہو ثابت ہوئیں۔ بڑی آپا اپنی سال کی اکلوتی بہو تھیں۔ مگر اس کے باوجود ساس نے کبھی سیدھے منہ بات نہ کی۔ موتی بہو موتی طعنے دیتیں۔ کام میں دن رات لگائے رہتیں۔ اور بے بات پر ٹوکتی رہتیں۔ مگر ایک لائق بہو کی طرح آپا سب کچھ برداشت کر جاتیں۔

بڑی آپا کے اندر ایک اچھی ماں کا دل بھی تھا۔ وہ لوری اور منو کو جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔ جیسا کہ ہر ماں کو ارمان ہوتا ہے کہ ان کے بچے سب کو پسند آئیں۔ وہ انہیں نماز، روزہ، چھوٹی موٹی غزل سکھا دیتی ہیں تاکہ موتی پر اس کا استعمال کیا جاسکے۔ بڑی آپا نے بھی اپنے بچوں کو اچھے سے اچھا بنانے کی کوشش کی۔ یہ الگ بات ہے کہ شمن کو بد سے بدتر بنا دیا۔ بڑی آپا اپنی بیٹی اور بیٹے کا پورا خیال رکھتیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ جب وہ اپنی بیٹی کی شادی طے کر لیتی ہیں۔ اس کے بعد ایک ذمہ داراں کی طرح اپنے سارے خرچ روک کر بیٹی کے جہیز کی تیاری کرنے لگیں۔ انہیں معلوم تھا کہ بن باپ کی بیٹی کے لئے ماں ہی سب کچھ ہوتی ہے اور اسے ہی سب کچھ کرنا پڑتا ہے مرنے اور جینے پر انسان کا اختیار نہیں ہوتا، آپا کے شوہر کے انتقال کے بعد وہ بیوہ ہو کر گھر آگئیں تو گویا سب پر احسان کیا۔ وہ بار بار لوگوں کو اپنے بیوہ ہونے کی یاد دلاتی رہتیں، اور جتنا بھی فائدہ اس بیوہ ہوتے سے ہو سکتا بڑی آپا نے بڑی چالاکی سے وصول کیا، وہ مکاری، جھوٹ، دنا دھونا اور ایسے سبھی ہتھیاروں

سے کام لینا جانتی تھیں اور بوقت ضرورت لیتی بھی تھیں۔

بیوہ ہونے کے بعد آپ کے کردار میں چالاک، مکاری اور دکھاوا زیادہ آگیا تھا وہ تیوہار کے دن رونا پٹنا مچاتیں۔ بار بار گھر والوں کو طعنے دیتیں۔ وہ سادہ کپڑا پہنتیں تو گویا گھر والوں پر احسان کرتیں۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھیں کہ خود تو رنگین کپڑے چوڑیاں اور مہندی وغیرہ استعمال نہ کریں اور گھر کے سارے افراد استعمال کریں۔ یہ ان سے برداشت نہ ہوتا۔ عید وغیرہ کے موقع پر چوڑی والی کو دیکھ کر یا پسی مہندی کو دیکھ کر وہ اکثر رونا دھونا مچاتی تھیں۔ یہ کردار ان لوگوں میں سے ایک ہے کہ نہ ہم خود کھائیں گے نہ دوسروں کو کھانے دیں گے۔ بزرگ میں بھنگ ڈالنا ان کی عادت بن چکی تھی۔ اسی جین میں کہ وہ جلدی کیوں بیوہ ہو گئیں ہیں۔ وہ دن بدن اور زیادہ بد مزاج ہوتی جا رہی تھیں۔ آپ اس نظریہ کی حامی تھیں کہ چوں کہ وہ بیوہ ہیں اس لئے ہر کسی کو کچھ بھی کہہ دینا ان کا حق ہو گیا ہے۔

بڑی آپا حالانکہ بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں اور سب کے دکھاوے کے لئے ان کا دل بھی شوہر کی موت کے ساتھ مر گیا تھا۔ مگر اس دکھاوے کے باوجود وہ اپنی خوب صورتی اور رکھ رکھاؤ کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ ان کی سادگی میں بھی رنگینی چھپی رہتی۔

”نہیں کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ بڑی آپا رنگین دھبے نہیں اوڑھتی تھیں تو ہمیں نے بالکل سنیا ہی لے لیا تھا۔ اس کے سفید کپڑوں میں بھی وہ رنگینیاں ہوتیں تو وہ کھل اٹھتی اور ایک دفعہ تو نئی دھن کا سرھاگ جوڑا بھی اندر پڑ جاتا۔ سفید کرپ یا شفٹ کا دوپٹہ جس پر بچاری بیوہ نازک سی بکئی کی بیل چپکالیتی سفید چکن کا کرتا، سارا گلا مہین مہین سیلوں اور ریشمی ڈوریوں سے آراستہ، قدم قدم پر ستاروں کے جال اور موتیوں کے پھندے۔ ہاں پچامے

پر رنڈا پاتا رہنے کی ضرورت نہیں بھرکا ہی یا آسمانی پوت کا جمبول دار پچامہ ہاتھوں میں دہی رنڈا پاتا رہتے وقت جو ماموں نے دو۔ دو نازک سی بانگیاں ڈال دی تھیں۔ بڑی ہوئی تھیں اور مرنے والے کی نشانی زمرہ کی انگشتری اور بس۔ ہاں سنبلی بوا اگر کبھی زبردستی اوپر

” بڑی آیا بالکل بدل گئی تھی۔ اسکی دوستی مونچھ والی عزیز بیگم سے ہو گئی تھی۔ عزیز بیگم کے میاں انہیں قتل کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ مگر وہ تو بڑی آیا سے دوپٹہ بدل رشتہ قائم کر چکی تھیں۔“

بڑی آپا کے کردار کا ایک پہلو وہ بھی ہے جہاں وہ نوری کے لئے بڑکے پھنسانے کا کام کرتی ہیں اور نوری کو اس کے لئے کسی بار استعمال بھی کرتی ہیں۔ بڑی آپا نے اس وقت اپنا چولا بالکل بدل دیا جب ان کی بیٹی جوان ہونے لگی تھی اور انہیں اس کی شادی کی فکر ستانے لگی تھی۔ وہ ایک ہوشیار ماں کی طرح ابھر کر سامنے آتی ہیں۔

” ساس اور بہو نے مل کر لڑکا گھیرنے پر کمر باندھ لی۔ علاوہ نوری کی ذاتی صفات کے اس کی تپائی کا سارٹیفکیٹ ہر جگہ کار آمد ثابت ہوا اور جلد ہی ایک نہایت مالدار اور اکلوتے بڑکے کو اس پر عاشق کرالیا گیا۔ اس کے کنبے والوں نے لاکھ اور دھم بچائی مگر ایک نہ چلی۔“

حالانکہ آپا کا کردار عام کردار معلوم ہوتا ہے لیکن ان کی نفسیاتی الجھنوں کا بیان عصمت نے بہت خوب صورت انداز میں کیلئے ہے۔

مجموعی طور پر ٹیڑھی لکیر میں آپا کا کردار اپنی خوبیوں اور خامیوں کی وجہ سے انفرادیت قائم رکھتا ہے اور حیتا جاگتا کردار معلوم ہوتا ہے۔

رائے صاحب پریمیا کے والد تھے۔ ان کا کردار بہت مختصر مگر اہم ہے رائے صاحب کا اثر شتمن کی شخصیت پر بہت زیادہ پڑتا ہے۔ وہ نہ صرف رائے صاحب کی شفقت اور محبت کو غلط سمجھتی ہے بلکہ ان سے اپنے عشق کا اظہار بھی کر لیتی ہے اس کردار کے اندر کسی شخص چھپے نظر آتے ہیں۔ کہیں پر رائے صاحب ایک ذمہ دار باپ نظر آتے ہیں۔ کہیں لچھے دورست، کہیں فلسفی اور کبھی آرٹ کے دلدادہ۔ ان کا کردار تہہ دار (ROUND) کردار ہے اور ایسے کرداروں کو اچھے کردار کے دائرے

میں رکھا جاتا ہے۔ رائے صاحب حالانکہ بوڑھے ہیں مگر ان کی جسمانی کشش متاثر کرتی ہے۔ رائے صاحب ایک خوب صورت شخصیت کے مالک ہیں۔
 ”خوب صورت مضبوط مگر چہرہ پر جسم، اونچا قد اور تپے ہوئے سولنے جیسا رنگ، اس پر چاندی سے بھی زیادہ اچلے بالوں کا ڈھیر“۔
 ان کا قد اونچا، گھٹا ہوا کمرتی جسم، گھنے خوب صورت بال جو آدمے کا لے اور آدمے سفید ہیں۔ بڑی بڑی ہرنی جیسی آنکھیں، ذہانت کے نشے میں چور، چوڑا سینا اور اس پر سو ڈول باہیں دیکھ کر دشمن کو وہ کوئی نروچی دیوتا معلوم ہوتے، رائے صاحب کی شخصیت ہی ایسی جانب نظر تھی جو دیکھتا متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا اور یہی وجہ تھی کہ دشمن جو اعجاز اور نریت درجیے اپنے ہم عمر نوجوان لڑکوں سے متاثر نہ ہوئی تھی رائے صاحب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ انہیں پوجنے لگی تھی۔ رائے صاحب دشمن کو دیوتا معلوم ہوتے تھے۔

رائے صاحب کی بیوی کا انتقال ہوئے کافی عرصہ گزر چکا تھا مگر اپنے بچوں کی محبت کی وجہ سے انہوں نے دوسری شادی نہ کی تھی۔ جب کہ ان کی پرانی محبوبہ بھی موجود تھیں اور قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اب بھی ان کا ”مس فلپ“ سے عشق چل رہا تھا کیوں کہ اکثر وہ بہت غصہ اور اداس ہو جایا کرتے تھے۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ ”مس فلپ“ کا اب بھی ان پر رعب تھا اور وہ ان سے متاثر تھے۔ پریم اور دشمن کی بات چیت سے رائے صاحب اور مس فلپ کے تعلقات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

”شاید مس فلپ سے لڑائی ہوگئی۔ وہ بھی تو شکار کو گئی تھیں، پریمانے اسے ڈرائنگ روم کے آخری کونے میں لے جا کر کہا۔

”کون ہیں یہ مس فلپ؟“ ہیں ایک، ایک انسپکٹر آف اسکول ہیں، رائے صاحب کی کلاس فیلو تھیں۔ شادی بھی طے ہوگئی تھی مگر جب انگلینڈ میں رائے صاحب ممبئی سے ملے تو بس نہ جانے کیوں

دو دن میں شادی بھی کر ڈالی۔ ط

جہاں رائے صاحب کا کردار ایک جذباتی نوجوان کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے کہ اپنی سنگیت کو چھوڑ کر وہ دن میں ہی کسی اور لڑکی سے متاثر ہو کر شادی کر لیتے ہیں۔ مس فلپ سے ان کا عشق بعد میں بھی باقی رہتا ہے۔ بیوی کے ہوتے ہوئے بھی رائے صاحب اس گھنٹوں باتیں کیا کرتے۔

”ہاں تو، می کی زندگی ہی میں یہ گھنٹوں آکر بیٹھا کرتی تھیں۔“ ۲

بیوی کے انتقال کے بعد انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھ کر ہی شادی نہ کی۔ رائے صاحب ایک ذمہ دار زندہ دل اور اپنے بچوں کی چھوٹی چھوٹی خوشی کو پورا کرنے والے ایک باپ بن کر قاری کے سامنے آتے ہیں حالانکہ قاری کو ان کی محبت میں کبھی بھی چھچھوڑا پن بھی نظر آتا ہے۔ وہ بچوں کے ساتھ کھیلتے، تیراکی کرتے ان سے ہنسی مذاق کرتے ان کے ساتھ چاٹ کھاتے اور اس قدر کھل کر ملتے جیسے ایک دوست۔ وہ بچوں کے ساتھ بچہ ہی نظر آتے۔

{ ”پریمیا کہتی تھی کہ ماں کے مرنے کے بعد انہوں نے دوسرا بیاہ نہیں کیا۔ دونوں بچوں کے لئے سب کچھ بن کر رہ گئے۔“ ۳ }

{ ”انہیں کتنا ارمان تھا کہ بہت نہیں تھوڑا ہی سہی کچھ تو آرٹ سے ان بچوں میں بھی لگاؤ پیدا ہو جاتا۔“ ۴ }

رائے صاحب اپنے بچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی خوشی کے لئے وہ ان کے اچھے دوست بن جلتے اور ان کے ساتھ بالکل انہی کی طرح باتیں کرتے۔ ان کی محبت

ط ٹیڑھی لکیر عصمت چغتائی - ۱۹۴

۲ ” ” ” ۱۹۴

۳ ” ” ” ۱۸۹

۴ ” ” ” ۱۸۹

میں بناوٹ نہ ہوتی مگر قاری کو اجنبیت ضرور محسوس ہوتی ہے۔ رائے صاحب جیسے باپ کا منفرد کردار عصمت چغتائی ہی تراش سکی ہیں۔

رائے صاحب اپنے بچوں سے بہت بے تکلف تھے۔ پریمیا کو گود میں اٹھالینا اپنے اوپر بیٹھالینا اکل کے گالوں میں تنکا چبھانا، گدگدی کرنا اس کے ساتھ کھیلنا اور نہنا انہیں بہت پسند تھا۔ بچوں کے سامنے وہ بچہ بن جاتے اور خوشی مناتے۔ وہ بچوں سے ایسی دوستی کرتے ہیں جیسے وہ ان کے ہم عمر ہوں۔ بے تکلفی کی انتہا تو یہ ہے کہ وہ آپس میں گالیاں بھی بڑی بے تکلفی سے دے دیتے ہیں۔

صرف اپنے بچوں سے ہی نہیں بلکہ پریمیا کی دوست شمن سے بھی وہ بہت جلدی بے تکلف ہو گئے اور اے بھی پریمیا کی طرح پیار کرنے لگے۔ حالانکہ ان کی محبت پاک تھی مگر بچوں کو اس قسم کی عجیب و غریب محبت سے شمن کا کبھی پالا نہیں بڑا تھا۔ اس وجہ سے وہ ان کی محبت پریشان ہو جا یا کرتی۔

رائے صاحب بچوں کی خوشی کے واسطے ان کو کہانیاں بھی سنایا کرتے اور اس وقت بالکل معصوم معلوم ہوتے۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ کیونکہ وہ تعلیم یافتہ بھی تھے اور ہر فن مولا بھی۔ اس لئے کہانی کہتے وقت وہ بالکل بچہ بن جاتے۔

”کچھ لوگ تو انہیں چھپھور کہتے تھے اور بعض انہیں فلسفی مجذوب اور نہ جانے کیا کچھ سمجھتے تھے۔ شمن کو وہ ناروجی اوتار معلوم ہوتے۔“

رائے صاحب کے کردار کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ انہیں فنون لطیفہ سے خاص لگاؤ ہے۔ وہ ایک اچھے موسیقار، ڈانس اور مصور ہیں۔ جب موڈ ہوتا ہے کسی راگ کو چھیڑ دیتے اور گایا کرتے وہ اچھی آواز کے مالک ہیں۔ اور راگوں کی انہیں اچھی پہچان بھی ہے۔ گفتگوں ناچتے اور فرصت کے وقت تصویریں بنانا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ انہیں ان سب سے نہ صرف لگاؤ تھا بلکہ ریاضت بھی اچھی تھی اگر رائے صاحب کو آرٹ کا شیدائی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

رائے صاحب کو خود بھی گانے کا شوق تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ان کے بچے بھی ہندوستانی

کلاسیکی راگ سے واقف ہوں۔ تبھی تو ایک روز وہ اپنی بیٹی کو فلمی گانا گاتے سن کر برہم ہو گئے تھے۔

”رائے صاحب نے اسے کوئی فلمی گیت گاتے سنا تو ملامت کرنے لگے۔ راگ راگنیاں بھول کر وہ ٹپ ٹپ میں پڑتی جا رہی تھی۔

طنبور اسٹاکراہوں نے نہ جانے کس راگ کا الاپ شروع کر دیا۔ پیر کے نیچے سے تال دیتے جاتے۔۔۔۔۔ نہ جانے کیا سر تھے۔ دھیمے اور نرم جو احساسات پر بھوار کی طرح برستے رہتے۔“ ۱

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ رائے صاحب ایک زندہ دل باوقار اور تعلیم یافتہ انسان شفیق باپ اور اچھے دوست کے ساتھ ہی ساتھ وہ ایک بند باقی انسان بھی ہیں۔ ان کے کردار میں ایک عجیب سی کشش ہے اور جمجمہ و راہن بھی۔ رائے صاحب کا کردار حالانکہ مختصر ہے مگر مکمل ہے اور ارتقائی منزلوں سے ہوتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ ہر لمحہ اس کے کردار کے بارے میں کوئی نہ کوئی نئی بات معلوم ہوتی ہے جو قاری کو متاثر کرتی چلتی ہے اور آہستہ آہستہ قاری بھی انہیں پسند کرنے اور چاہنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی موت پر دشمن کے ساتھ ساتھ قاری کو بھی صدمہ پہنچتا ہے۔ رائے صاحب کا کردار ٹیڑھی نیکر کا ایک منفرد اور یادگار کردار ہے۔

عام طور سے کرداری ناول میں ایک ہی کردار اہم مانا جاتا ہے۔ باقی سب اس ایک کردار کو بنانے یا بگاڑنے کے لئے لائے جاتے ہیں ویسے تو اس میں کئی ایسے کردار ہیں جنہوں نے دشمن کی زندگی کو متاثر کیا۔ مگر افتخار ایک ایسا کردار ہے جو کافی عرصہ تک دشمن کی زندگی میں چھپا رہا۔ اور دشمن اس کی شخصیت سے متاثر بھی ہوتی ہے۔ ٹیڑھی نیکر کے کرداروں کے بارے میں اسلم آزاد لکھتے ہیں۔

”دشمن کے علاوہ اس ناول کے دوسرے تمام کردار ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان ضمنی کرداروں کو ناول نگار نے دشمن کے کردار کو سبک زیادہ

موثر اور مضبوط بنانے کے لئے استعمال کیا ہے۔ یہ تمام کردار اپنے اپنے
موقع و محل میں بالکل موزوں اور مناسب ہیں۔" ۱

افتخار عصمت چغتائی کے ناول ٹیڑھی ٹیکر کا ایک اہم کردار ہے۔ یہ کردار بذات
خود پرکشش اور مضبوط ہے۔ یہ دشمن کے کردار کو بھی بخوبی پختہ بناتا ہے۔ اس کردار کے کئی
پہلو ہیں کہیں وہ سیاسی لیڈر کہیں ہنس مکھ نوجوان کہیں وہ ذہین اور کبھی فراڈ نظر آتا ہے۔
حالانکہ اس کی شکل صورت اچھی نہیں ہے تاہم اس میں کشش ہے اس کو دق کی بیماری ہے مگر اس
کے باوجود شروع میں قاری کو اس کردار سے بہت ہمدردی ہو جاتی ہے۔ مگر جب آخر میں اس
کی بیوی حسین بی آکر اس کردار کا دوسرا روپ دکھاتی ہے جس سے قاری پہلے آشنا نہیں تھا
تب اس سے ایک ایک ہمدردی ختم ہو کر اس کی جگہ نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کردار کی خصوصیت
یہ ہے کہ وہ دوہری شخصیت کا مالک ہے اور ایک شخصیت دوسری شخصیت سے مختلف ہے بالکل
سیاہ و سفید کی طرح۔

افتخار ایک ذہین اور خوش مزاج رٹکا ہے وہ جس محفل میں بیٹھتا ہے سب پر چھا
جاتا ہے لوگ اس کی آمد پر خوش ہوتے ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے محفل کے لئے اہم بنا دیتا
اس کی شخصیت کا یہ پہلو بڑا متاثر کن معلوم ہوتا ہے۔ دشمن جب پہلی مرتبہ کالج کی پارٹی میں
شریک ہوتی ہے اس وقت وہ بالکل نئی تھی اس ماحول کے لئے اور اس کا پارٹنر بھی۔ ان دونوں
کو بوند ہوتے دیکھ کر افتخار ان کے یح پہنچ جاتا ہے اور اس قسم کی باتیں کرتا ہے کہ دونوں یہ
بھول جاتے ہیں کہ وہ اس پارٹی سے گھبرائے ہوئے اور پریشان تھے۔

"افتخار نے دونوں کو چھیڑ چھیڑ کر بے تکلف بنا دیا۔" ۲

"افتخار نے اتنا مذاق کیا کہ دشمن کو جیسے گرز کی پوٹلی سے نکال کر

اپنے چبوترے پر کھڑا کر دیا۔" ۳

۱ اردو ناول آزادی کے بعد اسلم آزاد ص ۱۳۹

۲ ٹیڑھی ٹیکر عصمت چغتائی ص ۱۸۰

۳ " ص ۲۲۹

نہایت اور جاذبیت
نہایت اور جاذبیت
نہایت اور جاذبیت

کی صورت کے لحاظ سے افتخار نہایت معمولی تھا۔ مگر اس کے پاس گفتگو کی
ایسی طاقت تھی کہ وہ جب چاہتا بڑے سے بڑے بھڑکے ہوئے مجمع کو خاموش کر دیتا
اور جب چاہتا خاموش لوگوں میں فساد کی چنگاری لگا دیتا۔ افتخار اپنی چرب زبانی کے بل پر
ہی کلنج میں سب پر رعب ڈالتا تھا۔ کلنج میں پر تسپیل سے لے کر طالب علم بھی اس کے رعب
میں رہا کرتے۔ کلنج کے ہر کام میں وہ پیش پیش رہتا اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ہر دل عزیز بھی تھا
مگر اکثر لوگ اس کے بارے میں یہ رائے بھی رکھتے تھے کہ یہ مکار قسم کا آدمی ہے اور اپنے مطلب

نہایت اور جاذبیت
نہایت اور جاذبیت
نہایت اور جاذبیت

بعض لوگوں کا خیال تھا کہ افتخار مقصد اور مکار تھا۔ اس کی زبان اس
قدر طرار تھی کہ چند لمحوں میں ساری یونیورسٹی کو بہکا دیتا۔ مگر جوہی
دل میں کوئی نیا خیال پیدا ہوتا بڑے سے بڑے فساد کو ذرا سی دیر
میں ختم کر دیتا۔ اسی لئے منتظمین کو ہر معاملے میں اس کی مدد کی ضرورت

نہایت اور جاذبیت
نہایت اور جاذبیت
نہایت اور جاذبیت

لیکن افتخار اپنی صلاحیتوں کا استعمال کم سے کم اور بدتر جگہوں پر کرتا ہے۔ وہ سوچنے میں
بلند خیالوں اپنے خوابوں کا مالک ہے۔ اس کے احساسات بلند ہیں مگر عملی طور پر وہ
مکڑور ہے اور اپنے سوچنے کا ایک تہافہ حصہ بھی پورا نہیں کرتا۔ ایسا اس کے بارے میں کہتی ہے
”سہی دیکھو افتخار کتنا خوشیلا کتنا سچا ہے مگر صرف وہاں تک جہاں
تک تعمیر کا سوال ہے وہ جو کچھ سوچ سکتا ہے کاش اس کا تہائی بھی
عمل کی صورت ظاہر کر سکتا تو وہ ہندوستان کا سچا رہنما ثابت
ہوتا نہ جلنے کیا نہ جاتا۔“

نہایت اور جاذبیت
نہایت اور جاذبیت
نہایت اور جاذبیت

افتخار کو اپنے والدین اور خاندان سے بہت محبت ہے۔ وہ اکثر اپنے گھر سے ہونے لحات
اس کا بچپنا بہت غریبی میں گزرا۔ والد کا انتقال بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ ایک بہن
مگر جلد ہی وہ بھی لے چھوڑ کر چلی گئیں۔ وہ اکثر ان لوگوں کو یاد کرتا۔ ایسا معلوم

نہایت اور جاذبیت
نہایت اور جاذبیت
نہایت اور جاذبیت

ہوتا تھا کہ وہ ان رشتوں کو ابھی تک بھول نہیں پایا ہے۔ اس کی باتوں سے محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔

انتہا کو سیاست سے بھی لگاؤ ہے وہ جانتا ہے کہ ملک آزاد ہو مگر وہ کس کیلئے کیا کام کرتا ہے معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ اس کی باتیں اکثر ادھوری اور بے نیکی ہوتی تھیں۔ وہ دشمن سے کئی بار اپنے گروہ کے بارے میں ذکر کرتا ہے اور جیل بھی جاتا ہے۔ مگر کسی وجہ سے یہ بات واضح نہیں ہوتی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی آزادی کے لئے کام کرتا ہے۔ اسے سیاست سے بھی لگاؤ ہے۔ وہ دشمن سے سیاسی گفتگو بھی کرتا ہے۔

انتہا ایک عاشق مزاج اور رومانی نوجوان کے روپ میں بھی سامنے آتا ہے وہ دشمن کو دل و جان سے محبت کرتا ہے۔ اس کی ایک ایک بات کی خبر جیل اور سنی ٹورم میں رکھتا ہے۔ وہ کئی بار چند منٹوں کے لئے دشمن سے ملنے بھی آتا ہے۔ اسے برابر خط لکھتا ہے۔ مگر اس محبت میں جسم نہیں شامل نہیں۔ وہ زبانی محبت کرتا ہے ایک پاک اور صاف محبت۔ ایک لمبی مدت تک دشمن سے دوستی رکھنے کے باوجود بھی اس کا ہاتھ تک نہیں تھامتا۔

ٹیڑھی لکیر میں حسین بی کی آمد سنسنی خیز طریقہ سے ہوتی ہے اور اس سے انتہا کی قافی اتر جاتی ہے اور قاری کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ نہ صرف دشمن کو اپنے جال میں پھنساتے ہوئے تھا بلکہ اس کے جیسی کئی اور لڑکیاں اور عورتیں تھیں جو اس کے جال میں پھنسی ہوئی تھیں۔ وہ ایک دھوکے باز آدمی ہے۔ اس کی محبت پاکیزگی اس کی سیٹی باتیں اور اونچے خیالات سب چھپوڑے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اس کی بیوی اور تین بچے تھے مگر اس کے باوجود کئی لڑکیوں سے بیک وقت عشق کیا کرتا تھا اور سب سے تحفے روئے پے وصول کرتا تھا۔ حسین بی کی باتوں سے شک ہوئے لگتا ہے کہ کہیں ان دونوں کی ملی جلی تو نہیں کہ انتہا محبت کے خطوط لڑکیوں کو لکھے اور اس کی بیوی لڑکیوں کو ملک سیل کر کے یہ وصول کرے۔ کیونکہ انتہا ایک نودق کام نہیں کرتا تھا۔ دوسرے نوکری بھی نہیں کرتا تھا۔ اس لئے آخر میں قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کہیں یہ عشق بازی کا پھر صرف پیسہ وصول کرنے

کے لئے تو نہیں چلتا تھا۔ افتخار کا کردار اور اس کی بیوی کے ذکر کے بغیر ادھر رہے اس لئے اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔

”حسین بی“ افتخار کی بیوی ہے۔ تین بچوں کی ماں۔ اس کی آمدن اول میں تب ہوتی ہے جب افتخار دشمن سے آخری بار ملنے آتا ہے اور یہ کہہ کر میلا جاتا ہے کہ پتہ نہیں اس بیماری (T.B.) سے نجات بھی ملے یا نہیں۔ اس کے بعد حسین بی کی آسودہ داغ میں ایک شک بھی پیدا کر دیتی ہے۔

چند مکالموں اور حادثات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افتخار کے اپنی بیوی سے اچھے تعلقات بھی تھے اور اس کی بیوی اس کی ہر بات کو جانتی بھی تھی۔ کیوں کہ ایسا نہ ہوتا تو دشمن یا پھر اور لڑکیوں کے خطوط حسین بی کے پاس کیسے موجود ہوتے۔ دوسرے یہ کہ وہ دشمن کے پاس رات میں چند گھنٹوں کے واسطے آتا تھا۔ اس بات تک کی جانکاری حسین بی کے پاس تھی۔ افتخار کو اپنی بیوی بچوں کا خیال بھی تھا۔ اس لئے اس نے روپے بھیجے تھے اور اور اپنے کئی پرانے سوئیر بھی۔

”پار سال سو روپے دے گیا تھا۔ دوسو سوئیر بھی دیئے تھے کہ ادھیڑ کر بچوں کے بنائے تو میں نے منے اور اسلم کے لئے

بنادینے۔“

ان باتوں سے ایسا شک پیدا ہوتا ہے کہ حسین بی اور افتخار دونوں علی کرمدوم لڑکیوں کو پھنساتے اور بلیک میل کر کے دولت وصول کرتے ہیں۔

حسین بی ایک ڈھیت، مکار اور چالاک عورت کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے حالانکہ وہ رو کر یہی کہتی جاتی ہے کہ اس کے لیے شوہر سے خراب تعلقات ہیں اور افتخار ایک فراڈ انسان ہے لڑکیوں کو پھنساتا ہے مگر اس کے باوجود وہ خود ایک ڈھیت عورت ہے وہ دشمن کے گھر بڑی دھونس کے ساتھ گھس آتی ہے اور جب دشمن اسے بھگانے کی کوشش کرتا ہے تو حسین بی صاف صاف کہہ دیتی ہے

کہ مجھے ان گیدڑ بھکی سے مت ڈراؤ اور جو کچھ مجھے کہنا اور تم سے سنا ہے سب کہہ سن کر ہی واپس جاؤں گی وہ دشمن کی دھمکیوں کو ہنس کر ٹال دیتی ہے
حسین بنی دشمن کو اس کا خط دکھاتی ہے اور اس کے ساتھ یہ دھمکی بھی دیتی ہے کہ وہ اس کے گھر والوں کو بھی بھیج سکتی ہے۔ اس سے گھر والوں کی عزت میں بڑے لگ سکتا ہے۔

اس نے دشمن کو بتایا کہ تم افتخار کو روپیہ بھیجتی رہی ہو۔ ملوہ بنا کر بھیجا اور سوٹر بن کر دیا۔ جب دشمن خوف کی وجہ سے خود افتخار کی محبوبہ ہونے سے انکار کرتی ہے تو وہ بڑی چالاکی سے دشمن کو پست کر دیتی ہے۔

”جھوٹ نہ بولو۔۔۔۔۔ میرے پاس آپ کے خط موجود ہیں“ ط {

دشمن کو خط دکھاتے وقت وہ بڑی چالاکی اور مکاری سے یہ بتا دیتی ہے کہ خط چھیننے کی کوشش نہ کرنا ورنہ برا ہوگا۔ دشمن کا خط دھوٹہ نئے کے لئے وہ ایک بڑے تھیلے میں سے کئی بندل نکالتی ہے۔ یہ سبھی خط افتخار کی محبوباؤں کے تھے۔ حسین بنی نہ صرف یہ بتا دینا چاہتی تھی کہ دشمن کے بارے میں اسے سب معلوم ہے بلکہ اور لڑکیوں کے جو تعلقات افتخار کے ساتھ ہیں وہ بھی اسے اچھی طرح معلوم ہیں۔ حسین بنی بڑی چالاکی سے دشمن کو بلیک میل کرتی ہے۔ نہ صرف اس کے محبت بھرے خطوط دکھاتی ہے بلکہ ایسی باتیں بھی کر دیتی ہے جس سے اسے شرمندگی ہو۔ اور حسین بنی ایک ”سینئرڈنٹ صاحب“ کی بیوی کا قصہ بھی نہایت صفائی سے بیان کر جاتی ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے خطوط پانے کے لئے اپنے زیورات دینے کی کوشش کی۔ مگر حسین بنی نے اس دور سے زیورات نہیں لے کر تھیں وہ اپنے شوہر کہہ کر جیل کی ہو انہ کھلا دے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ حسین بنی خط کے بدلے عورتوں کو بلیک میل کرتی ہے۔ وہ دشمن سے بھی اس کے زیورات اتر والیتی ہے۔ اس طرح وہ ایک تربیت یافتہ ٹھگ کی طرح نظر آتی ہے۔

صرف ہی نہیں بلکہ وہ نیمہ کے آنے کے بعد شمن کو چھوڑ دیتا ہے اور پھر سارا وقت نیمہ پر خرچ کرتا ہے۔ اس طرح وہ عاشق مزاج نوجوان ہے۔ شمن اور نیمہ ہی نہیں بلکہ اس نے جس اسکول اور کالج سے تعلیم حاصل کی تھی اور کر رہا تھا وہاں ایک ساتھ کئی لڑکیوں سے دوستی کرتا ان کے ساتھ اپنا وقت اچھے سے اچھا گزارنے کی کوشش کرتا اور آگے بڑھ جاتا رشید بے فکر اور مطلب پرست اور من موچی لڑکے کے روپ میں ناول کے صفحات پر نظر آتا ہے۔ اس کی شخصیت میں کشش تھی اور زبان میں مٹھاس لڑکیاں اس پر ہمیشہ جان دینے کو تیار رہتیں اور کچھ امیر خاندان کی لڑکیاں تو اس سے صرف اس لئے ٹیوشن لیا کرتیں تھیں کہ رشید سے ملنے میں سہولت ہو جائے۔

”جس کالج یا یونیورسٹی میں پڑھائیں چار زخمی چڑیاں تڑپتی چھوڑیں۔ کالج کی بہت سی لڑکیاں ان کی دیوانی تھیں کئی امیر لڑکیاں تو ان سے ٹیوشن بھی لیتی تھیں۔“

رشید کا کردار اس لئے اہمیت رکھتا ہے کہ یہ پہلا لڑکا ہے جس سے شمن متاثر ہوتی ہے اور محبت بھی کرتی ہے۔ شمن کے کردار کو مکمل کرنے میں رشید کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ویسے یہ کردار بذات خود زیادہ اہم نہیں ہے بلکہ ان نوجوانوں کا کھلندڑے لڑکوں کی تصویر پیش کرتا ہے جو ایک ہی درجہ میں کئی کئی سال فیملی ہوتے رہتے ہیں مگر ٹیوشن کر کے لڑکیوں کو ضرور پاس کر دیتے ہیں۔

رونی ٹیلر ٹیڑھی لکیر کے مرد کرداروں میں سب سے زیادہ اہم کردار ہے۔ یہ (رونی ٹیلر) آئرش نوجوان ہندوستان میں انگریزوں کی نوکری کرتا ہے۔ اس کا کردار شروع سے آخر تک مستقل بدلتا رہتا ہے۔ کبھی یہ ایک جذباتی اور محبت کرنے والے نوجوان کے روپ میں نظر آتا ہے تو کبھی ہندوستانی کلیم اور ادب کا دلدادہ وہ اپنی بیوہ ماں اور بہن کو بہت چاہتا ہے اکثر اپنے بچپن کے گزرے سنہرے دن کی یاد کیا کرتا۔ رونی ٹیلر اپنے دل میں ہندوستانیوں کے لئے رحم کا جذبہ رکھتا ہے ہندوستانی سیاست سے اسے بہت گہرا لگاؤ ہے وہ اکثر

ہندوستانیوں اور یہاں کی سیاست کے لئے فکر مند ہو جاتا ہے۔

عام طور پر عصمت کے نادلوں میں مرد کردار ضمنی حیثیت ہی رکھتے ہیں جتنے کردار میں ضمنی طور پر ٹیلر کا کردار بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اس کے کردار کے کئی پہلو ہیں جو وقت و وقت پر اجاگر ہوتے ہیں سب سے پہلے وہ ایک نرم اور خوش مزاج لوجوان نظر آتا ہے۔ وہ تسکھی سے تسکھی طنزیہ باتوں کو ہنس کر ٹال دیتا ہے اسے معلوم ہے کہ ہندوستان میں سفید مٹری کو لوگ اچھا نہیں سمجھتے اس کے باوجود وہ یہاں کے لوگوں میں محبت تلاش کرتا ہے شمن سے کئی بار بحث بھی ہو جاتی ہے۔ شمن اسے جلی کٹی سنانے سے بھی نہیں چوکتی اس کے باوجود وہ شمن کو چاہتا ہے۔ اور اس کی باتوں کو ہنس کر برداشت کر جاتا ہے۔ وہ ایک نرم مزاج کا آدمی ہے جو زندگی کو، ہنسی خوشی گزارنے کا قائل ہے۔

رونی ٹیلر اپنی بیوہ ماں سے بہت محبت کرتا ہے اس کی ماں کا کردار حالانکہ صرف خطوط کے ذریعہ ناول میں ابھرتا ہے مگر اس سے ٹیلر کی محبت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ وہ شمن سے شادی سے پہلے اور بعد میں بھی اکثر گزرے دنوں کو یاد کرتا اور بہن اور والدہ کی محبت کا ذکر کرتا ہے۔ ماں کے خط کو دیکھ کر وہ اس قدر خوش ہوتا ہے کہ جیسے کوئی پھوٹا بچہ۔ وہ اپنی منیگر کو بھی یاد کرتا ہے اور اس کے جواب زدینے پر بھی وہ بار بار خط لکھتا ہے۔ ہزاروں میل دور بیٹھا ٹیلر صرف اپنی والدہ کی محبت کی وجہ سے اپنے آپ کو مضبوط اور خوش قسمت انسان سمجھتا ہے۔

رونی ٹیلر ادب سے خاص لگاؤ رکھتا ہے۔ اسے نہ صرف انگریزی ادب سے لگاؤ ہے بلکہ عربی شاعری سے بھی خاص لگاؤ ہے۔ شادی کے بعد وہ اور شمن ادب سے متعلق باتیں کیا کرتے۔ بحث ہوتی، ایک دوسرے کی پسندنا پسند پر تنقیدیں ہوتیں کہیں پیڑ کے سائے میں شعر و شاعری کی جاتی اور دونوں اسی میں غرق رہتے۔ اسے کٹش بائرن عمر ختام اور شیلمے کی تخلیقات بہت پسند تھیں۔

وہ آئرش ہوتے ہوئے بھی۔ مرچ مصالحہ اور چٹ پٹے کھانے کا شوقین ہے۔ اسے ہندوستانی کلچر اور ادب کے ساتھ ساتھ یہاں کے کھانے میں بھی مزا ملتا ہے۔ حالانکہ وہ ان کو کھاتے وقت بالکل بدحواس ہو جاتا ہے آنکھوں سے پانی بہہ نکلتا ہے مگر وہ

ان کھانوں کو نہیں چھوڑنا۔ شامی کباب۔ پھلیاں اور خوب مرچوں والا سالن اس کے پسندیدہ کھانے تھے۔

ناول کے آخری حصے میں وہ ایک محبت کرنے والا شوہر بن کر ابھرتا ہے مگر اس کو یہاں کامیابی نہ مل سکی۔ اسے شمن سے شدید محبت تھی وہ سماج سے دنیا والوں سے اس کی خاطر لڑنے کو تیار ہے۔ اسے دنیا والوں کی فکر نہیں جبکہ شمن بے میل شادی سے گھبراتا ہے اور ناکامیاب ہونے کے ڈر سے انکار بھی کرتا ہے مگر ٹلیہ ساری دنیا سے لڑنے کو تیار ہے۔ اسے شمن کے سفید دانت، لمبے بال اور کالی آنکھیں بہت پسند ہیں۔ وہ اسے بار بار بندی لگانے کی تاکید کرتا ہے۔ وہ شمن کی طرح طرح سے دلجوئی کرتا ہے۔ وہ شمن کی خوشی کی خاطر ہندی فلم دیکھتا ہے جبکہ اسے ساری فلمیں ایک جیسی ہی معلوم ہوتی ہیں۔ شادی سے پہلے اسے گھومنے پھرنے ہوٹلوں میں کھانا کھانے کا بہت شوق تھا۔ مگر شادی کے بعد وہ صرف شمن کے ساتھ وقت گزارنے کی خواہش رکھتا ہے۔

”نہیں..... بس یہیں تمہارے پاس..... وہ اس سے لگ کر گھاس پر لیٹ گیا پورا مہینہ چٹکیوں میں سوتے جاگتے ہنستے بولتے گزر گیا“

”تمہاری محبت کی خاطر سوچو تو اگر تمہیں چاہتا نہیں تو پھر“

ٹلیہ کی اکثر شمن سے لڑائی ہوتی اور دونوں میں بات چیت بند ہو جاتی اور دونوں اکثر ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے بھی روادار نہ ہوتے تب تھک ہار کر ٹلیہ شمن سے صلح کر لیتا اور الزام خود اپنے اوپر لے لیتا اپنے آپ کو خوب برا بھلا کہتا اور شمن سے دوبارہ دوستی کر لیتا۔ یہاں وہ ایک سمجھدار آدمی نظر آتا ہے۔ مگر وہ گرم مزاج آدمی بھی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر غصہ ہو جاتا ہے۔ اور ہفتوں شمن سے بات نہیں کرتا۔ اسی غصہ کی وجہ سے وہ گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ جہاں اس کے کردار میں کئی اچھائیاں ہیں وہیں چند کمزوریاں بھی سب سے پہلی بات تو یہ کہ شمن سے جس قدر شدت سے محبت کرتا ہے اسی شدت سے نفرت بھی اور غصہ بھی کرتا ہے۔

اگر ٹیلر نے تھوڑی سی سمجھداری سے کام لیا ہوتا تو اسے گھر چھوڑ کر نہ جانا پڑتا۔ شمن شروع سے ہی شادی کے خلاف تھی مگر ٹیلر اسے اونچ نیچ سمجھا کر شادی کے لئے تیار کر لیتا ہے۔ شروع میں تو وہ ساری دنیا سے لڑنے کو تیار تھا مگر چند ہی ہفتوں میں وہ سماج سے خوف کھانے لگا۔ لوگوں سے ملتے ہوئے کتراتا اور پارٹی میں نہ جاتا۔ وہ ایک جذباتی اور جلاباز لڑکھن جو ان کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ ٹیلر حساس طبیعت کا مالک ہے اسے کسی کی بری بات بہت جلد بری لگ جاتی ہے اور اسی جلدی سے وہ خوش بھی ہو جاتا ہے۔ اپنی طبیعت کی جلد بازی کی وجہ سے بعد میں حالات سے سمجھوتہ نہ کر پایا اور گھر بار بیوی۔ ماں سبھی کو چھوڑ کر میدان جنگ میں چلا گیا۔ اسے سوچنا چاہئے تھا اسے شمن کو سمجھنا چاہئے تھا۔ آخر میں اس نے بہت جلد بازی میں اپنی قسمت کا فیصلہ کیا۔ اور یہی اس کے کردار کی سب سے بڑی کمزوری بھی ہے۔ کسی چیز کو چھوڑنے سے پہلے اس کی اصلاح ضروری ہوتی ہے جو اس نے نہیں کیا۔

شمن کی زندگی کے جس باب کی شرعاً ٹیلر کے ساتھ ہوئی تھی وہ ناکامیاب رہی۔ دونوں چند مہینوں کے علاوہ کبھی خوش نہیں رہے۔ ازدواجی زندگی ٹانگوں بھری ناکامیاب زندگی کہی جاسکتی ہے۔ جس میں ہمدردانہ فہم کا فقدان اور ناقابلِ اندیشی کی کارفرمائی زیادہ نظر آتی ہے۔ اور جس کے نتیجے میں اچھی خاصی ازدواجی زندگی جہنم کا نمونہ بن جاتی ہے۔ مجموعی طور پر ردنی ٹیلر کا کردار ایک جذباتی عاشق کا کردار ہے۔ جو شمن سے محبت کے بعد اس سے شادی کر لینے میں ناکامیاب ہو جاتا ہے۔ لیکن ازدواجی زندگی کی ناکامیوں کو برداشت کرنے یا ان کا کوئی حل نکالنے کے بجائے ”راہ فرار“ اختیار کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتا ہے۔

(ایٹما) ایٹما ٹیڑھی لکیر کے کرداروں میں ایک باغی عورت کی حیثیت سے ابھرتی ہے۔ وہ خوبصورت اور جوان ہے اس کے پاس اپنے خیالات اپنے احساسات ہیں وہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے اور یورپ کے نئے فلسفہ ”فری سیکس“ ”FREE SEX“ کو ماننے والی ہے۔ اس کی نظر میں کسی ایک کا ہو کر رہنا عورت کی توہین ہے وہ کئی مردوں سے تعلق بناتی ہے۔ توکری کرتی ہے۔ مگر آخر تک بچپن رہتی ہے۔ اس کے کردار میں عصمت نے ان لڑکیوں کی تصویر کشی کی ہے مارڈن بننے کی کوشش تو کرتی ہے اپنے عمل سے بن بھی جاتی ہیں مگر ہندوستانی سماج میں عصمت کا نمونہ بن جاتی ہیں۔ ایٹما کا بچپن کردار ان لاکھوں لڑکیوں کی بولتی تصویر ہے جو یورپ

کی اندھی نقل کرتی ہیں مگر سکون نہیں پاتیں۔

ایسا شمن کی سہیلی ہے وہ دیکھنے میں بہت خوبصورت ہے اور مزاج سے باغی وہ مذہب کا مذاق اڑاتی ہے۔ اس کی نظر میں کرشن۔ پیغمبر۔ مسیح کسی کا کوئی وقت نہیں ہے۔ کرشن بھگوان کی تصویر اپنے کمرے میں ٹانگی ہے اور یسوع مسیح کی شان میں گیت گاتی ہے۔ وہ ہر مذہب کا مذاق اڑاتی ہے اسے یہ بھی اعتراض ہے کہ پیغمبر صرف مرد ہی کیوں ہوئے عورت کیوں نہ ہوئی اس کے اکی عجیب و غریب خیالات کی وجہ سے اسے اسکول اور ہاسٹل سے نکالنے کی کئی بار دھمکی بھی دی گئی تھی۔

ایسا "فری سیکس" FREE SEX کو برا نہیں مانتی وہ شادی کے سخت خلاف ہے۔ اس کی نظر میں شادی فضول باتیں ہیں انسان کو چاہئے کہ جب جس شخص سے چاہے اپنی جسمانی خواہش پوری کرے۔ کالج کے زمانے میں اس کے کئی لڑکے دوست تھے۔ انتقال اور سٹیل اس کی اچھی مثال ہیں۔ حالانکہ اسے سٹیل سے نفرت تھی مگر پھر بھی جسمانی خواہش کو پورا کرنے کے لئے وہ اپنے ضمیر کی آواز بھی نہیں سنتی۔ وہ بڑے کھلے انداز میں شمن سے اپنے دوستوں کا ذکر کرتی ہے۔ وہ ایک تیز اور منہ پھٹ لڑکی ہے۔ اس کی نظر میں کسی لڑکے کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ اس کا کردار ہندی ناول نگار لیش پال کے ایک اہم ناول "دادا کامریڈ" نام کی ناول کی ہیروئن کی طرح ہے۔

"لیش پال کی ہیروئن کسی ایک کاہنہ کو بندھن یا ڈھکوسلا سمجھتی ہے اسے جو مرد بھی اچھا جھتا ہے اسی پر اپنے دل کا پیارا انڈیلے کو تیار رہتی ہے یعنی اس نے اپنے لاشعور کو کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔ اس پر سماج کے کسی دباؤ کسی پابندی کو تسلیم نہیں کرتی"۔

ایسا بھی اس قسم کی لڑکی ہے۔ سماج اور اس کے بنائے قانون اس کے لئے اہمیت نہیں رکھتے۔ وہ مذہب کی پابند نہیں ہے۔ سماج کی پابندیوں سے وہ بغاوت کرتی ہے۔ مردوں کے بارے میں اس کے کھلے خیالات سے شمن بالکل گھبر جاتی ہے۔ مردوں کی قسموں

کے بارے میں اس آزاد خیال لڑکی کا خیال کچھ اس طرح ہے۔
 "اگر میں تمہیں بتاؤں کہ مردوں کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے جن کا

..... جو..... ہمایا۔ آ؟ "شمن نے ڈر کر پوچھا۔

جنہیں دیکھ کر دل میں ایک عجیب خواہش جاگ اٹھتی ہے، مثلاً جیسے
 انتخار ہے۔ اب مجھے اس سے محبت نہیں ہے، وہ بڑا عجیب مگر سیراجی چاہتا ہے کہ

میرا پہلا بچہ انتخار کا ہو۔"

"لیکن ایک لمبے سفر میں انتخار کو نہیں بھگت سکتی۔"

ایسا ایک فلسفی کی طرح ہر بات کو بہت غور اور فکر کے ساتھ دیر تک سوچتی ہے اسکی
 نظر میں یہ زندگی خدا نے موج مستی کے لئے دی ہے اس لئے انسان کو اپنی خوشی کو زندہ رکھنا
 چاہئے اور زندگی ہنسی خوشی سے گذارنی چاہئے۔ مگر اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کے
 باوجود بھی وہ خوش نہیں بہت مردوں سے اس کے تعلق تھے مگر جب وہ سیٹل کے بچے کی ماں
 بننے والی تھی وہ برداشت نہیں کر پاتی اور بار بار اپنے آپ کو گنہگار تسلیم کرتی ہے۔

"میں نے اپنی روح کو دھوکہ دے کر جسم کا پیٹ بھر دیا۔"

مگر وہ شادی کے لئے تیار نہیں وہ سیٹل کو نچا د کھانے کے لئے اس سے شادی
 سے صاف انکار کر دیتی ہے مگر مجبوری میں بچہ پیدا کر کے اسے ماں کا پیار بھی نہیں دے پاتی
 اور تب بھی وہ ایک فلسفی کی طرح سوچتی ہے کہ کیا یہ بچہ ناجائز صرف اس لئے کہ سماج کی
 اجازت کے بغیر یہ اس دنیا میں آیا ہے۔

ایسا کہ کردار میں ایک ناکامیاب لڑکی جیسی ہے جس نے کبھی بھی اپنے دماغ سے کام
 نہیں لیا بلکہ دل کی پکار سن سن کر دوڑتی رہی مگر آخر میں وہ بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے
 کہ انسان کی سچی خوشی کسی ایک کا ہونے میں ہی ملتی ہے اور آخر میں وہ پروفیسر کے ساتھ
 رہنے لگتی ہے۔

ص ۲۳۲ - ۲۳۳

عصمت چغتائی

۱۔ ٹیڑھی لیکر

ص ۳۲۱

" "

" "

ص ۲۳۲

" "

" "

اس کا کردار ارتقائی اور کامیاب ہے۔ اس آزاد خیال لڑکی کا کردار عصمت نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

شمن ایلمائے بہت متاثر ہوتی ہے اور اس کی جیلا بن جاتی ہے مگر شمن نے کبھی صرف ایلمائے باتوں یا خیالات کو آنکھ بند کر کے نہیں مانا بلکہ اپنی عقل سے کام لیتی ہے عصمت نے ایلمائے کا کردار ایک آزاد خیال موڈرن لڑکی کے روپ میں کامیابی سے پیش کیا ہے۔

رسول فاطمہ اور نجمہ ٹیڑھی لکیر کے ٹیڑھے لیکن عجیب اور اہم کردار ہیں۔ جو اپنی خوبیوں کی وجہ سے نہیں بلکہ کج روی کی وجہ سے یادگار بن گئیں ہیں۔ ناول ختم کرنے کے بعد بھی رسول فاطمہ اور نجمہ کے نقش نظروں میں گھومتے رہتے ہیں۔ اور ہم انہیں بھول نہیں پاتے۔ رسول فاطمہ شمن کی "روم میٹ" تھی۔ اور جنسی کج روی کی زبردست شکار تھی۔ اس کی شکل صورت عادت سبھی کچھ نہایت گھناؤنی اور بھڑکی ہے۔ وہ "ہم جنسیت" کی شکار ہے اور شمن سے اس کی تکمیل چاہتی ہے۔ یہ ایک ایسا گھناؤنا کردار ہے جسے دیکھتے ہی شمن میں نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ کبھی رسول فاطمہ سے سیدھے منہ بات نہ کرتی۔ نہ صرف اسکی عادتیں گری ہوئی گھٹیا تھیں بلکہ اس کی شکل بھی۔

"اسکی باہر کو ابلی ہوئی آنکھیں ضرورت سے زیادہ بڑی اور بے رونق تھیں جیسے چٹٹی تھالی میں دو مینڈک رکھے ہوں باریک سیدھی سیدھی تنکو جیسی پلکیں اور کھر درے بھورے رنگ کے پوٹے ہر وقت ان میں بے کسی غربت اور بے وقوفی چھلکتی رہتی تھی" لے

رسول فاطمہ اس ناول میں ایک تیز ہول کے مہونے کی طرح آئی اور گزر گئی مگر اپنی حرکتوں اپنے عمل اپنے مکالموں کی وجہ سے قاری کے ذہن میں رہ جاتی ہے۔ حالانکہ اس کردار میں کوئی اچھی بات نہیں ہے مگر پھر بھی اسکا کردار جاندار اور زندہ ہے شاید محمد احسن فاروقی کی بات کسی حد تک یہاں ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔

"قوت تخلیق رکھنے والے ناول نگار کے کردار چاہے جتنے بھدے

ہوں چاہے جتنے نامکمل ہوں مگر ان میں جان ضرور ہوتی ہے اور وہ ہمارے
 دلوں کو اپنی طرف کھینچ ضرور لیتے ہیں ایک حد تک اس کی قوت بیان،
 اس کی تشکال نگاری اس کی قوت قصہ گوئی کردار کی تخلیق میں مدد دیتی ہے۔ ۱۱۵
 رسول فاطمہ کا کردار مختصر ہونے کے باوجود ایک خاص وجہ سے قاری کو اپنی طرف متوجہ
 ضرور کر لیتا ہے۔ یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

بخمہ ایک خوبصورت اور نازک لڑکی ہے جس سے ہاشل کی بہت ساری لڑکیاں محبت
 کرتی ہیں۔ اس کی نزاکت، نفاست اور خوبصورتی کی وجہ سے ہی شمن جیسی لڑکی بھی اس پر مرنے
 لگی تھی۔ اس کے اندر ایک خاص قسم کی کشش ہے اسے دیکھ کر لذت کا احساس ہوتا ہے عصمت
 چغتائی کے الفاظ میں۔

”بخمہ بڑی نازک تھی معلوم ہوتا تھا اس کے جسم میں ایک بھی بچی
 ہڈی نہیں۔ شمن کا دل اس کو چھونے کے خیال سے گھبرانے لگتا۔ گرم اور نرم
 ایسی کہ اگر ہاتھوں میں لے کر زور سے دباؤ تو ابے ہوئے انڈے کی طرح
 پھیل جائے“ ۱۱۶

بخمہ کی شاید وہ کشش ہی تھی جس نے اسے بہت ساری لڑکیوں کا چہیتا بنا دیا تھا۔
 نہ صرف سعادت بلکہ شمن بھی اسے ہی جان سے چاہنے لگی تھی۔

بخمہ بھی نفسیاتی مریضہ ہے یہ رسول فاطمہ کی ضد ہے کیونکہ پہلے رسول فاطمہ شمن پر برا
 کرتی تھی۔ اور اس کی قربت کی مستلاشی رہتی یہاں شمن بخمہ پر مرنے لگی تھی۔ اور اس کی قربت
 کرتی تھی۔ ناول ختم کرنے کے بعد یہ کردار اپنی خوبصورتی نزاکت اور لذت کی وجہ سے
 قاری کے ذہن میں رہ جاتا ہے۔

لوری شمن کی آپا بی کی بڑی بیٹی تھی اور شمن کی ہم عمر بھی یہ ایک سیدھی لڑکی کے روپ
 میں ہمارے سامنے آتی ہے جس نے ہندوستانی عام بچوں کی طرح بچپن میں انگریزی میں ناک،

لوری

آنکھ اور کان کے مطلب بتائے کچھ بڑا ہونے پر گڑ یا گڈ سے سے کھیلی اور تھوڑی بہت تعلیم حاصل کر کے شادی کے بندھن میں بندھ گئی۔ اگر اس کردار کو الگ کر کے دیکھتے ہیں تو اس میں کوئی انفرادیت نظر نہیں آتی مگر جب عصمت کی ناول ٹیڑھی لکیر کی ہیر و من شمن کے ساتھ اسکا بیان کرتے ہیں تو یہ ایک اہم کردار بن جاتی ہے۔

نوری ایک ایسی کردار ہے جس نے شمن کو نہ صرف موقع بہ موقع نچاد کھایا بلکہ اس کے اندر احساس کمتری بھی پیدا کر دی شمن کی آپا نے اپنی نوری کو بہتر تعلیم دینے کے لئے شمن کو جگہ جگہ ذلیل کیا اور اس کا حق چھینا۔ شمن کے کردار کے ارتقار کے ساتھ ساتھ نوری کے کردار کا بھی ارتقار ہوتا ہے۔

نوری کا کردار شمن کی حریف بن کر آتا ہے۔ نوری نے کئی جگہ شمن کو ذلیل کیا اور شمن کا حق چاہے وہ پیار پانے کا ہو یا تحفہ پانے کا ہو اسے چھین لیا۔ شمن کی منجھوبی جب شادی ہو جانے کے بعد پہلی مرتبہ گھر آتیں ہیں اس وقت شمن کی گندی حالت کو نوری اس طرح کہتی ہے۔

”گندی ہیں یہ بھنگن کی لونڈیا، نوری اترائی اور منجھو کی گود میں چڑھ بیٹھی۔“

”خارہ جان شمن مہترانی کی لڑکی ہے یہ انہیں نانی نے بھنگن سے دو پیسے کو لیا تھا،“

اکثر اس نے شمن کا حق بھی چھینا۔ شمن کو چونکہ منجھوبی نے پالا تھا اس لئے شمن کا حق زیادہ تھا مگر اس کی جگہ اکثر نوری نے لے لی اور شمن آئسوہاتی رہ گئی۔

چونکہ نوری شمن کی ہم عمر تھی اور دوسرے آپا کی بیٹی اور اس پر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ یتیم تھی۔ نوری حالانکہ خود دل کی بری نہیں تھی مگر گھر والوں نے اس کو اچھا ثابت کرنے کے لئے اکثر شمن کو حقیر ثابت کیا۔ ہر بات میں شمن سے اس کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔

”نوری گوری ہے وہ کالی، نوری نازک وہ بھدی۔ نوری“

{ ہنس مکھ، شرمیلی، باتمیز اور پڑھنے میں تیز۔ وہ بد مزاج، بد تمیز اور بھوڑا۔
پڑھنے سے دم چراتی،،،،،

کہنا نہیں مانو گی تو شمن کی طرح پھٹکاریں گے سب۔
”ہناؤ گی نہیں تو شمن کی طرح جوئیں پڑ جائیں گی۔“
”پڑھ لو نہیں تو شمن کی طرح جاہل رہ جاؤ گی۔“
”پھر تم نے شمن کی طرح ضد کی۔“
”شمن کی طرح جھوٹ بھولنا خوب آتا ہے۔“

لوری عام یتیم بچوں کی طرح والدین اور خاندان کی لاڈلی تھی۔ جیسا کہ عام مسلمانوں یا ہندوستان گھروں میں ہوتا ہے کہ مہمان کے آتے ہی بچوں سے ان کی پڑھائی کے بارے میں پوچھا جاتا ہے۔ لوری نے عام مسلمان خاندان کی بچی کی طرح عمل کیا والدین کے کہنے پر وہ اپنی پڑھائی کے متعلق بتاتی تب یہ ایک عام بچی معلوم ہوتی۔ اس میں تھوڑی سی تیزی اور تھوڑا سا بھولا پن بھی ہے۔ صبح سلام کرنا، دوسروں کے سامنے جائے نماز پر کھڑے ہو کر نمازیوں کی نقل کرنا۔ اور انگریزی میں نظمیں سنانا اس کی تیزی اور بھولے پن کی مثالیں ہیں۔

لوری کا کردار بھی دھیرے دھیرے ابھر کر سامنے آتا ہے۔ حالانکہ خاندان والوں نے لوری کو ہمیشہ شمن سے بہتر اور بلند مقام دیا تھا مگر جیسے جیسے اس کی عمر بڑھتی جاتی ہے وہ شمن سے قریب ہوتی جاتی ہے۔ اس کے اندر نہ نادرٹ ہے نہ چالوسی حالانکہ کبھی شمن کو حقیر سمجھتے تھے مگر اس کے باوجود اس نے شمن سے دوستی کی جو آخر تک قائم رہی۔ دونوں ساتھ ساتھ گڑیا کھیلتی۔ مسجد کے ملاکات ماشہ دیکھتی اور اسکول کے ہاسٹل میں اکثر ساتھ رہتیں۔ ان دونوں میں اکثر لڑائی بھی ہوتی مگر اس کے باوجود دونوں اچھی دوست رہیں۔ بچپن کی یہ دوستی آخر تک قائم رہی اور دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتیں رہیں۔ لوری کی شادی کے موقع پر جب یہ دونوں بچھڑی ملیں تو

گھر کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ نوری کی شادی ہو چکی ہے لہذا الوٹے
میں رک گئی نوری اندر کمرے میں مایہوں بیٹھی ملی شمن کو دیکھ کر وہ اس
سے لپٹ گئی..... مگر نہ جانے کیوں دونوں طرف سے پیارا بل پڑا بڑی
محبت سے دونوں ایک ہی رضائی میں لپٹ کر سوئیں اور رات گئے تک
باتیں کرتی رہیں۔۔۔۔۔

نوری نے ایک ہندوستانی لڑکی کی طرح شرافت سے اپنی تعلیم مکمل کی نہ اس نے کبھی
کلاس میں ٹاپ کرنے یا کھیل کود میں حصہ لینے کی فکر کی اور نہ پڑھائی میں کبھی فیل ہوئی اس
نے پڑھائی شروع کی اور سیدھے سادے طریقے سے تعلیم مکمل کر لی۔ اس نے جب بچپن سے
جوانی کی طرف قدم بڑھایا تو خاندانی پچیرے، میرے بھائیوں سے ہلکا پھلکا رومان لڑا بیٹھی
حالانکہ ابھی شادی میں کئی برس تھے مگر دن رات وہ رومانی خیالات میں کھوئی رہتی چونکہ
اسکی شادی شمن سے پہلے طے ہوئی تھی لہذا ایک بار پھر وہ شمن سے بہتر سمجھی جانے لگی اور اسے
خود بھی اس بات کا بار بار احساس ہوتا۔ اس نے اپنے جہیز کے لئے تیاریاں بھی شروع کر دی
تھیں۔ شادی طے ہونے کے بعد اس کے کردار میں یکایک بڑی تبدیلی آ گئی۔

”اسے اب احساس بزرگی بھی ہو چلا تھا، اس نے سارا
جلبلا پن بھی چھوڑ دیا تھا اور ایک دم گھروالیوں کی طرح سنجیدگی
اختیار کر لی۔ وہ شمن سے اپنے آپ کو کچھ تر خیال کرنے لگی تھی اس کا مول
اتنی جلدی ہو گیا۔“

نوری اپنے اندر ایک رومان بھر ادل رکھتی ہے اسے شادی کا بچپن سے ہی
شوق رہا تھا۔ پھر جب اس کی شادی طے ہو گئی تو اس کا سارا وقت اپنے ہونے والے شوہر
کے بارے میں انکی عادلوں کے بارے میں سوچنے میں کٹنے لگا۔ وہ اپنے ہونے والے شوہر
کے بارے میں کچھ زیادہ ہی ”کریزی“ ہے۔ اکثر رومانی خیالات میں کھوئی ہوئی رومانی باتیں کیا

کرتی ہے۔

نوری کا کردار اس کی شادی کے ساتھ اس ناول سے ختم ہو جاتا ہے۔ نوری متوسط طبقے کے عام مسلمانوں کے خاندان کی ایک لڑکی کے روپ میں آتی ہے۔ مجموعی طور پر اس کردار میں زیادہ انفرادیت نہیں ہے لیکن ارتقاء ملت ہے جو ایک اچھے کردار کی خوبی بھی ہے۔

بلقیس بھی ٹیڑھی لکڑی میں ایک اہم کردار بن کر ابھرتی ہے۔ یہ شمن کی اسکول کی پہلی ہے جو بعد میں اس کی روم میٹ بن جاتی ہے۔ اس کا کردار ایک صاف دل، منہ پھٹ، تعلیم یافتہ اور رومانی لڑکی کے روپ میں قاری کے سامنے آتا ہے۔ حالانکہ دشمن کی ہم عمر ہے اور اسی کے ساتھ پڑھتی بھی ہے۔ مگر اس کی معلومات اس دنیا کے بارے میں شمن سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ ایک چالاک اور مطلب پرست لڑکی کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ جس مسلم اسکول میں شمن تعلیم حاصل کر رہی تھی وہاں پر باقاعدہ "مرنے والیوں" کے نام سے ایک لمبا چوڑا گروپ تھا اس گروپ کی لڑکیاں آپس میں ایک دوسرے پر مراکتیں تھیں۔ مگر اس لمبے چوڑے اسکول کی ہزاروں لڑکیوں میں سے دوسری بلقیس ایسی لڑکی تھی جو شمن پر مرتی تھی۔

حالانکہ شروع میں بلقیس بھی لڑکیوں پر مراکتی تھی مگر جلد ہی ہی اس نے یہ محسوس کیا کہ محبت کرنے کے لئے لڑکے زیادہ مناسب ہوتے ہیں وہ ایک رومانی لڑکی تھی مگر اس سے زیادہ عملی بھی اس کے عاشقوں کی لمبی چوڑی تعداد ہے مگر لڑکوں سے شادی اور محبت اس بارے میں وہ اکثر بڑے فلسفیانہ انداز میں شمن سے باتیں کرتی۔

لڑکوں سے محبت کے نام پر تحفے وصول کرنا اور اس سے اپنے ناز خزانے پورے کر دانا خوب آتا ہے۔ شمن کو اکثر وہ لڑکوں کے بارے میں طرح طرح کی نئی نئی باتیں بتاتی ہیں اس سے اس کی رومانی طبیعت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ان سارے حربوں سے پوری طرح واقف تھی جس کے ذریعہ کسی کو محبت کے جال میں پھنسا یا جاتا ہے۔

بلقیس لڑکوں سے بہت زیادہ گھل مل جاتی ہے۔ وہ ایک رومانی پسند لڑکی ہے اس کا عشق سب کے سامنے چلتا۔ نہایت بے تکلف انداز میں لڑکوں سے پیش آتی اور ایک ساتھ کئی کئی لڑکوں سے عشق کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جسمانی چھٹیہ چھاڑ اس کی نظر

کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ عشق کو چھپانے کا قائل نہیں ہے بلکہ گھنٹوں بستر پر لیٹ کر دوسروں سے اپنے عشق کا بیان بڑی بے باکی سے کرتی ہے۔

بلقیس نہ صرف شمن کو چاہتی تھی بلکہ اس کی اچھی دوست بھی تھی۔ وہ شمن کے دل کا حال پوچھتی اور اپنا اسے بتاتی۔ وہ صاف دل کی لڑکی ہے اور اپنی دوست سے کسی قسم کا کوئی پردہ نہیں رکھتی دونوں گھنٹوں بستر میں اور سر جوڑے باتیں کرتی رہتی ہیں۔

بلقیس اس ناول کا واحد کردار ہے جسے آج کل کی فلمی ہیروئن کی طرح کپڑوں بالکل لگاؤ نہیں ہے وہ کم سے کم کپڑے پہن کر بڑے آرام سے لڑکوں سے باتیں کرتی ان سے مذاق کرتی۔ اس کے آنکھوں میں شرم نام کی نہیں۔ وہ بے انتہا کھبے شرمی سے دوسروں کے سامنے بیٹھی رہتی۔ لڑکیوں کے سامنے برہنہ رہنے میں اسے کوئی حرج نظر نہ آتا اس کا خیال تھا کہ کم از کم لڑکیوں سے کیا شرمانا، شرم و حیا جو عورت کا زیور ہے بلقیس اس سے محروم ہے۔ اس پر کسی کی باتوں کا نصیحت کا بہت کم اثر ہوتا اور وہ اکثر باتوں کو ایک کان سے سن دوسرے کان سے نکال دیتی

”گودہ بڑی بے شرم تھی اور بغیر کسی جھجک کے کپڑے اتار دیتی

تھی۔ نہانے جانے سے پہلے وہ کپڑے اتار کر جوئیٹوں اور منچروں کے کاٹے کے نشان اپنے جسم پر ڈھونڈا کرتی تھی..... اس کا جسم بڑا خوبصورت اور سڈول تھا جسے دیکھ دیکھ کر وہ آئینے میں آپ ہی آپ مسکرایا کرتی..... نہانے کا ارادہ کر کے وہ کپڑے کبھی نہ نکالتی بلکہ نہا کر یونہی لحاف میں دیک جاتی جب خوب گرم ہو جاتی اور سارے جسم کے روئیں سونے کے تاروں کی طرح چمک اٹھتے تو وہ کپڑے نکالتی رہے۔

صرف بلقیس لڑکیوں سے ہی بے تکلف نہیں تھی بلکہ بلقیس سمیت ساری بہنیں لڑکوں کے سامنے کم سے کم کپڑوں میں جاتیں اور اپنے روشن خیال ہونے کا ثبوت دیتی۔ لڑکوں سے بے تکلفی اس حد تک تھی کہ سب کے سامنے عشق ہوتا اور بھی مجبوری طور پر اس سے لطف اٹھاتے۔

پڑھی لکھی کا یہ کردار نہ صرف ناول کو آگے بڑھاتے ہیں تو ادا کرتے بلکہ ناول کی ہیروئن شمن کے کردار پر اثر انداز بھی ہوتا ہے اور زندگی کے ایک ایسے پہلو کے بارے میں اس کی معلومات میں اضافے کا باعث بنتا ہے جس سے شمن اب تک نا آشنا تھی۔

قادری عرف کدن ایک چھوٹا سا لڑکا ہے نہایت ڈرپوک، بزدل و بواور رونا۔ وہ نجیبی کی ساس کا پوتا ہے۔ اس کا کردار ایک ایسے بچہ کا ہے جس کے والدین نہ ہوں اور دادی اسے دلار میں بگاڑ رہی ہو۔ اس کی عادتیں خراب تھیں اور ساتھ ہی اس کی شکل بھی ناگوار شمن نے اسکو پہلی نظر میں ہی نا پسند کر دیا تھا۔ بات بات پر رونا، دادی اماں کے پیچھے لگے رہنا اور ہر بات میں ضد کرنا اس کی شکل کچھ اس طرح تھی۔

”لال چقدر رنگ اور نیلی نیلی بے جیسی آنکھیں پکا گال۔“

کدن نہایت ڈرپوک تھا۔ وہ اپنی دادی کے ساتھ سوتا اور ہر وقت انہی کے ساتھ چپکار ہوتا تھا۔ شمن کا خوب رعب مانا کیوں کہ وہ اسے اکثر مار دیا کرتی تھی۔ دادی کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اس نے دادی کی ساری عادتیں سیکھ لیں تھیں مان کے ساتھ پان کھاتا چولہے کے پاس گھس کر بیٹھتا۔ ویسی ہی بوڑھوں جیسی باتیں کرنا وغیرہ۔ شروع میں وہ ایک بزدل اور ڈرپوک بچے کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔

کدن اپنی دادی کو بہت چاہتا تھا وہ دادی کے بغیر اپنے آپ کو ادھورا اور غیر محفوظ سا محسوس کرتا۔ اس کے اندر احساس کمتری شدت سے تھی وہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتا بھی نہیں۔ دادی اماں کا دوڑ دوڑ کر کام کرتا اس کا کھلونا بھی عام بچوں کی طرح نہیں بلکہ ”سروتا“ قسم کی چیزیں ہوتیں جس سے وہ گھنٹوں کھیلا کرتا۔

کدن ایک چغلمور بچے کے روپ میں بھی نظر آتا ہے وہ ہر بات دادی سے پوچھ کر کرتا ہے اور ادھر ادھر کی سنی باتوں کو فوراً جا کر دادی سے کہہ دیتا ہے۔ بات بات میں ڈر جانا سب کی ڈانٹ سن لینا اور دوڑ دوڑ کر کام کرنے کے علاوہ اس کا کوئی اور مشغلہ نہ تھا۔ حالانکہ یہ کردار کہ بذات خود کوئی اہمیت نہیں رکھتا مگر اس کی وجہ سے ہمیں یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ شمن جو

جو اس ناول کی ہیر دین ہے کس طرح کے بچوں کو پسند کرتی ہے۔ اور کنیوں۔ اسے بزدل، دلوں اور ڈرپوک بچوں سے نفرت سی تھی اور شاید اس لئے بھی کہ اس نے کبھی ڈرنا اور بزدلی سیکھا ہی نہیں تھی۔

اعجاز عرف اجوتا در عرف کدن سے ملتا جلتا ہی ایک کردار اور بھی اس ناول میں نظر آتا ہے۔ وہ ہے اعجاز عرف اجو۔ اجو شمن کی بیوہ خالہ کالو کا ہے چونکہ خالہ نے دوسری شادی کر لی تھی اس لئے اجو شمن کے گھر رہنے اور تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آگیا تھا۔ اس کے کردار کے دو پہلو ہیں جس طرح عام زندگی میں کوئی شخص ڈبل کیمرہ کا ہوتا ہے اسی طرح اعجاز بھی دوہری شخصیت کا مالک ہے چونکہ والدین سے الگ یہ شمن کے بھرے پورے گھر میں رہتا ہے۔ اس لئے یہ بچپن میں احساس کمتری کا زبردست شکار ہے مگر اعلیٰ تعلیم حاصل کر لینے کے بعد اس کے کردار میں تبدیلی آتی ہے اور وہ ایک خود مختار خود کفیل مکمل انسان بن کر سامنے آتا ہے۔

اجو کی مشکل مکروہ اور گھناونی اور عجیب و غریب قسم کی تھی جسے دیکھ کر وحشت ہوتی اس کی آنکھوں میں نندیدہ اپن ہوتا اور اکثر ایسا معلوم ہوتا کہ دوسروں کو بیٹھا گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ اس کے گورے چہرے پر سنہرے بال نہایت حقیر معلوم ہوتے اجو نہ کسی سے زیادہ بات کرتا تھا اور نہ اسے کھیلنے سے دلچسپی تھی وہ زیادہ تر کھانے پینے کے بارے میں سوچتا اجو کی آنکھیں گول گول بات کرنے والوں کا ہونٹ تکا کرتی تھیں۔

اجو کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا کہ وہ جنم جنم سے بھوکا ہے۔ دسترخوان پر سب سے پہلے کھانے بیٹھ جاتا ہے اور سب سے آخر میں کھا کے اٹھتا۔ اس کی بھوک کی انتہا تو بت ہوتی ہے جب دوسروں کا بچا ہوا کھانا۔ آم کی چوسی ہوئی گٹھلیاں، کھائی اور جپائی ہوئی ہڈی تک وہ کھا جاتا مگر پھر بھی اس کا پیٹ نہ بھرتا اور تب وہ کہتے کارا تپ اور مرغی کو ڈالنے والے دانوں میں بھی اپنا حصہ بنالیا کرتا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ سب کی پلیٹ میں بچے ہوئے کھانے کا بڑا قلم بنا کر رکھ لیتا اور دیر تک مزالے کر کھایا کرتا گھر کے بھی لوگ اس کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے۔ بچے ہوئے چاول اور دودھ جیسی ہوئی ہڈی اور آم کی گٹھلی کی لالچ دیکر کوئی بھی شخص اس سے کام کر داسکتا تھا اس طرح وہ ایک نندیدہ بھوکا اور نیت جلا بچے کے روپ میں قاری کے سامنے آتا ہے۔ کھانے کے معاملے میں لذت اور مزے کی اس کی نظر میں کوئی جگہ نہ تھی کھانا جیسا بھی باسی ہو یا تازہ

جو اس ناول کی ہیر دین ہے کس طرح کے بچوں کو پسند کرتی ہے۔ اور کنیوں۔ اسے بزدل، دلوں اور ڈرپوک بچوں سے نفرت سی تھی اور شاید اس لئے بھی کہ اس نے کبھی ڈرنا اور بزدلی سیکھا ہی نہیں تھی۔

اعجاز عرف اجو قادر عرف کندن سے ملتا جلتا ہی ایک کردار اور بھی اس ناول میں نظر آتا ہے۔ وہ ہے اعجاز عرف اجو۔ اجو شمن کی بیوہ خالہ کالو کا ہے چونکہ خالہ نے دوسری شادی کر لی تھی اس لئے اجو شمن کے گھر رہنے اور تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آگیا تھا۔ اس کے کردار کے دو پہلو ہیں جس طرح عام زندگی میں کوئی شخص ڈبل کیریکٹر کا ہوتا ہے اسی طرح اعجاز بھی دوہری شخصیت کا مالک ہے چونکہ والدین سے الگ یہ شمن کے بھرے پورے گھر میں رہتا ہے۔ اس لئے یہ بچپن میں احساس کمتری کا زبردست شکار ہے مگر اعلیٰ تعلیم حاصل کر لینے کے بعد اس کے کردار میں تبدیلی آتی ہے اور وہ ایک خود مختار خود کفیل مکمل انسان بن کر سامنے آتا ہے۔

اجو کی مشکل مکروہ اور گھناونی اور عجیب و غریب قسم کی تھی جسے دیکھ کر وحشت ہوتی اس کی آنکھوں میں نندیدہ اپن ہوتا اور اکثر ایسا معلوم ہوتا کہ دوسروں کو بیٹھا گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ اس کے گورے چہرے پر سنہرے بال نہایت حقیر معلوم ہوتے اجو نہ کسی سے زیادہ بات کرتا تھا اور نہ اسے کھیلنے سے دلچسپی تھی وہ زیادہ تر کھانے پینے کے بارے میں سوچتا اجو کی آنکھیں گول گول بات کرنے والوں کا ہونٹ تکا کرتی تھیں۔

اجو کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا کہ وہ جنم جنم سے بھوکا ہے۔ دسترخوان پر سب سے پہلے کھانے بیٹھ جاتا ہے اور سب سے آخر میں کھا کے اٹھتا۔ اس کی بھوک کی انتہا تو بت ہوتی ہے جب دوسروں کا بچا ہوا کھانا۔ آم کی چوسی ہوئی گٹھلیاں، کھائی اور جپائی ہوئی ہڈی تک وہ کھا جاتا مگر پھر بھی اس کا پیٹ نہ بھرتا اور تب وہ کہتے کارا تپ اور مرغی کو ڈالنے والے دانوں میں بھی اپنا حصہ بنا لیا کرتا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ سب کی پلیٹ میں بچے ہوئے کھانے کا بڑا قلم بنا کر رکھ لیتا اور دیر تک مزالے کر کھایا کرتا گھر کے بھی لوگ اس کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے۔ بچے ہوئے چاول اور دودھ جیسی ہوئی ہڈی اور آم کی گٹھلی کی لالچ دیکر کوئی بھی شخص اس سے کام کر داسکتا تھا اس طرح وہ ایک نندیدہ بھوکا اور نیت جلا بچے کے روپ میں قاری کے سامنے آتا ہے۔ کھانے کے معاملے میں لذت اور مزے کی اس کی نظر میں کوئی جگہ نہ تھی کھانا جیسا بھی باسی ہو یا تازہ

بات بات پر لوگ اسکو مارتے اور مذاق اڑاتے اور اب
 اجماع بالکل نیا چولا بدل کر آیا تھا وہ جھینپ اور چھپورا بن تو کوئی
 اس کی موجودہ ذات سے کسی طرح وابستہ نہ کر سکتا تھا۔ نہایت چرب زبان
 ہنس مکھ اور دلیر

اجو اور کڈن دو کردار اس ناول کے ایسے ہیں جن سے ہمیں شمن کی فطرت اور پسند
 ناپسند کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہے کہ وہ ڈرپوک۔ بزدل اور کمزور اور ظلم پسند
 والوں کو بالکل پسند نہیں کرتی۔ یہ دونوں ہی کردار اپنی اپنی جگہ بہت اہم اور کامیاب ہیں
 ٹیڑھی لکیر میں ایک ماں کا خوبصورت کردار عصمت نے بڑی خاموشی کے ساتھ
 پیش کیا ہے۔ یہ ماں شمن کی نہیں بلکہ اس کے شوہر ٹیلر کی ماں ہیں۔ جو ہندوستان سے کوسوں
 دور بیٹھی صرف خط کے ذریعہ اپنے بیٹے اور بہو کو پیار بھیجتی ہے۔ اس نے اپنے پیارے
 اور اکلوتے بیٹے کو جنگ کے لئے ہندوستان بھیج دیا تھا یہ ماں ہندوستان کی لاکھوں کروڑوں
 ماؤں کا ایک اچھا نمونہ بھی ہیں جس میں اپنے بیٹے اور ان کو بھی بہو کے لئے متلبہ ہے۔
 جب وہ سنتی ہیں کہ اس کے بیٹے نے ہندوستانی لڑکی سے شادی کر لی ہے تو بجائے
 خفا ہونے کے وہ بہت خوش ہوتی ہیں۔ ہزاروں دعاؤں کے ساتھ اپنا قیمتی زیور بھی شمن کو بھیجتی
 ہیں۔ وہ ہزاروں ہدایت اپنی بہو کو دیتی ہے کہ وہ اس کے بیٹے کی طرح سنبھالے۔
 اور ایک شمن کی لاپرواہ ماں کا کردار ہے یہ دونوں کردار آپس میں ایک دوسرے کی ضد
 ہیں ایک ماں کے اندر محنت کا ساگر ہے تو دوسرے میں پیار کا چٹیل میدان۔ ایک ہزاروں میل
 دور بیٹھی بھی اپنی ذمہ داری بخوبی نبھاتی ہے۔ دوسری صرف بچوں کی تعداد بڑھانے میں لگی
 ہے۔ اسے فکر ہی نہیں ہے کہ جو بچے اس نے پیدا کئے ہیں وہ پل بھی رہے ہیں یا مر گئے۔
 ناول میں شمن کی ماں ایک لاپرواہ اور بے حس ماں کے روپ میں ابھرتی ہے وہیں ٹیلر
 کی ماں مغربی ہوتے ہوئے بھی ایک خالص مشرقی ماں کے روپ میں سامنے آتی ہے جسے "مشالہ"
 بھی کہا جاسکتا ہے۔

عصمت کے اس ناول میں کردار نگاری جاندار اور ارتقائی ہے۔ چونکہ کردار مختلف ہیں اس لئے نہ صرف ان کے خاندان، طبقے، مزاج، مذہب، رہن سہن ان بھی کے بارے میں اچھی جانکاری بھی ملتی ہے۔ ان کے مرد اور عورت کرداروں میں عورت کا کردار زیادہ واضح اور خوبصورت ہوتا ہے۔ اس کے اندر کے جذبات کا بیان عصمت بخوبی کر پاتیں ہیں ان کے جذبات احساسات، اجماعی برائی، بغاوت نفرت کو عصمت اپنی آنکھوں سے دیکھتی اور قلم سے بیان کرتی ہیں۔ عورت کرداروں کے مقابلہ میں مرد کردار عموماً کمزور اور ناکامیاب ہیں۔ حالانکہ ان کے اندر جھانکنے کی کوشش بھی عصمت کرتی ہیں مگر گہرائی تک نہیں پہنچ پاتیں ایک خاص وجہ ان کا عورت ہونا بھی ہو سکتا ہے۔

مجموعی طور پر ان کے کردار عجیب و غریب انفرادی اور ارتقائی ہوتے ہیں زیادہ تر "ROUND" کردار پیش کرتے ہیں جو ماحول کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ بامد کردار ان کے ناولوں میں نہ کے برابر ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ عصمت کی ناولیں کردار نگاری کے لحاظ سے کافی مقبول بھی رہیں ہیں اور کامیاب بھی۔

"پٹرھی لیکر" کے کرداروں میں ہمیں انسانی سماج کے ایسے چہرے نظر آتے ہیں جو ہمارے جانے پہچانے چہرے تو ہیں لیکن ہم نے انہیں کبھی بغور دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور ان چہروں سے ان کے ذہن و دل کے نہاں خالوں میں اترنے کی کوشش نہیں کی۔ عصمت چغتائی نے ان کرداروں کے ذریعہ اپنے ارد گرد کی زندگی کو اس کی خوبیوں خامیوں، سچائیوں اور مثبت و منفی پہلوؤں کے ساتھ اجاگر کرنے کی میاب کوشش کی ہے۔ ان کرداروں کے ذریعہ مذہب، سماج، اخلاق، سیاست، اقتصادیات، اور محبت اور انسانی نفسیات اور ذہنی اور جنسی تجروری بھی کو ان کے صحیح سیاق و سباق میں ایک سچے اور ایماندار ناول نگار کی طرح پیش کر دیا ہے۔ اس طور پر یہ کردار ہمارے عہد کے سماج کا ایک زندہ دستاویز بن گئے ہیں۔

یڑھی لکیریں۔ بعض نفسیاتی الجھنیں

”ٹیڑھی لکیر“ کے سلسلے میں عصمت چغتائی نے دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے ”ٹیڑھی لکیر میں فرائڈ کے بدنام زمانہ اصولوں سے انحراف کر کے فرد کے ماحولیاتی اثرات پر زیادہ زور دیا ہے۔ عصمت نے ایک روسی خاتون کے نام خط میں لکھا ہے۔

”ٹیڑھی لکیر“ میں نے عام زندگی سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ اس کے تمام کردار زندہ ہیں، اپنے اور اپنے دوستوں کے خاندان میں۔ میں نے سائیکالوجی پر بہت سی کتابیں پڑھیں ان سے میں نے شمن کے کردار کا نفسیاتی تجزیہ کرتے وقت مدد ضروری۔ مگر فرائڈ کے اصول کے بالکل الٹ لکھا ہے۔ فرائڈ کہتا ہے کہ ہمارا ہر فعل جنسی تحریک سے ہوتا ہے مگر میں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ جنس اپنی جگہ ہے مگر ماحول کا اثر سب سے زیادہ ہوتا ہے۔“ لے

ڈاکٹر قمر رئیس نے عصمت کے اس دعویٰ کو صحیح مانتے ہوئے لکھا ہے کہ

عصمت کا یہ دعویٰ صحیح ہے۔ ”ہندی“ اور ”ٹیڑھی لکیر“ دونوں کے کرداروں کا مطالعہ اسی توازن نقطہ نظر کا ثبوت ہے۔“ لے

بہتر ہوگا کہ عصمت چغتائی اور ڈاکٹر قمر رئیس کے دعوؤں پر تبصرہ کرنے سے پہلے ہم فرائڈ کے نظریات پر ایک طائرانہ نظر ڈال لیں۔

ذہن کی ساخت کے بارے میں فرائڈ کا بنیادی خیال یہ ہے کہ ہر شعوری فعل کی تہہ میں لاشعور کی کار فرمائی ہوتی ہے۔ یہ لاشعور جبلی زندگی کا سرچشمہ اور نسلی ورثہ کا گودام ہے۔ اس گودام میں تمام وہ جذباتی تجربے جمع رہتے ہیں جن کا تعلق بچپن کی زندگی سے ہے۔ اور جن کا موضوع جنسیات ہے۔ یہ جذبات دراصل ان ہیچانوں، تمنائوں اور خواہشوں کے

مظہر ہیں جو شعوری زندگی کے معیار سے ٹکراتے ہیں اور اس ڈر کی وجہ سے کھلم کھلا ظاہر نہیں کیے جاسکتے۔

فرائڈ جنسیات کو زندگی کا سنگ بنیاد اور سب سے بڑا محرک سمجھتا ہے اس کے نزدیک جنسی نشوونما کی تین منزلیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک منزل پر انسان مختلف قسم کی الجھنوں میں مبتلا ہو جاتا ہے پہلی منزل نرگسیت یا خود فریفتگی (NARLESSISM) کی ہے۔ جو پیدائش سے پانچ سال کی عمر تک رہتی ہے اس وقت بچہ خود اپنی ذات پر عاشق ہوتا ہے لیکن اس کیساتھ وہ ایڈیپس گره OEDIPUS COMPLEX میں گرفتار ہو جاتا ہے یعنی لڑکے میں باپ کے خلاف جذبہ رقابت پیدا ہوتا ہے کہ اس کے جنسی ہیجانات کی تشفی کا ذریعہ اس کی ماں ہے جس پر اس کا باپ حاوی ہے لڑکی کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ شروع میں اس کی جنسی قوت کا مرجعہ ماں ہی ہوتی ہے لیکن جب اس کو محسوس ہوتا ہے کہ لڑکوں کی بہ نسبت اس میں ایک جسمانی کمی ہے تو وہ ماں کو اس کی کمی کا ذمہ دار سمجھتی ہے۔ اس ذہنی الجھن کو فرائڈ ”گرہ آفتگی“ سے موسوم کرتا ہے۔ لیکن یہ کمی لڑکی کو اپنے باپ کی ذات سے پوری ہوتی نظر آتی ہے۔ فرائڈ کے خیال میں لڑکی کا کافی عرصہ تک اس الجھن میں مبتلا رہتی ہے اور یہی کچھ عورت کی کمزوری کا باعث ہوتا ہے۔

فرائڈ انسانی شخصیت کا جو تصور پیش کرتا ہے اس کے مطابق اسرار اور ابہام سے پرے شخصیت کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

- 1- ID - اڈ
- 2- Ego ایگو
- 3- Super Ego فوق انا

اس کے نزدیک اڈ ان تجربوں اور آرزوں پر مشتمل ہے جو سماجی لحاظ سے ناپسندیدہ ہوتے ہیں اور انہیں وحشیانہ اور غیر مہذب سمجھنا چاہیے۔ ”انا“ کا تعلق مہذب سماجی زندگی سے ہے یہ سماجی زندگی بظاہر خوش گو اور حقیقتوں کو قبول کرتی ہے۔ اور شعوری

عمل کو تہذیب کے معیار پر پہنچاتی ہے۔ ”فوق انا“ شخصیت کا وہ جزو ہے، جو حاکم کی حیثیت رکھتا ہے اور ”انا“ کو ”اڈ“ کے وحشیانہ رجحانات کو دبانے کی ترغیب دیتا ہے۔ ”انا“ زندگی کے ابتدائی دور ہی میں جنم لیتی ہے، جب کہ بچے اور اس کے والدین کے درمیان ایک مضبوط جذباتی رشتہ قائم ہوتا ہے لیکن اس وقت انا چونکہ بہت کمزور ہوتی ہے اس لئے اڈ کی نامعقول شور و گودبا کر رکھنے میں اسے والدین کے اقتدار سے مدد لینی پڑتی ہے والدین ایک سخت گیر آقا کی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ بچپن کی ناجائز خواہشات کو جبر و تشدد سے دبا دیتے ہیں۔ شخصیت کا وہ حصہ جو اس طرح والدین کی طاقت اور اقتدار کو ظاہر کرتا ہے فوق انا کی بنیاد بن جاتا ہے۔ اور آگے چل کر اس میں وہ تمام سماجی قوتیں مرکوز ہو جاتی ہیں جو سماجی قوانین اور طور و طریقہ کی ضامن ہیں۔ گویا فوق انا سماج کی نمائندگی کرتا ہے اور اڈ فرد کی نمائندہ ہے۔ اور خود انا پولیس مین کے فرائض انجام دیتی ہے، کہ اس کا کام فرد سے سماج کے قوانین اور احکام کی تعمیل کرنا ہے۔ ————— ۱۷

فرائڈ کے اس نظریہ کے مطابق اڈ اور انا کے درمیان مستقل رسہ کشی ہوتی رہتی ہے۔ جب اڈ اپنی شکست تسلیم نہیں کرتی تو فرد مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ فرائڈ کی نفسیات میں ان کی ماہیت کو سمجھنا اور حل معلوم کرنا تحلیل نفسی کہلاتا ہے۔

”ذہنی امراض کے اسباب کا پتہ لگانے کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ ہم فرد کے شعور کا جائزہ لیں یا اس کے لاشعور کی گہرائیوں میں سرچ لائٹ ڈال کر دیکھیں کہ وہاں کیا کچھ کثافت اور گندگی پڑی ہے۔ ہمیں ان امراض کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے اس سماج کی ساخت اور تنظیم کا تجزیہ کرنا ہوگا جس میں یہ رونما ہوتے ہیں۔ ۱۸

اسی طرح تحلیل نفسی کے مشہور اہلکار نے تو فرائڈ کے شاگرد ہیں ذہنی بیماریوں کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا ہے

۱۲	ص	ڈاکٹر سلامت اللہ	تحلیل نفسی کے پیچ و خم	۱۷
۱۸	ص	ڈاکٹر سلامت اللہ	تحلیل نفسی کے پیچ و خم	۱۸

”ایک ایسے تمدن میں جہاں آدمی آدمی کا دشمن ہو ہمارے صنعتی نظام کا لب و لباب یہی ہے — بد اطواری ختم نہیں کی جاسکتی کیونکہ بد اطواری اور جرم ہمارے صنعتی تمدن میں زندگی کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ ۱۹

عصمت چغتائی کے شاہکار ٹیڑھی لکیر کا ہر کردار ہمیں نفسیاتی انجمنوں کا شکار نظر آتا ہے۔ ٹیڑھی لکیر کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں نوبل پرائز کمیٹی کے بعض ممبران کا وہ اعتراض یاد آتا ہے جو انہوں نے ارنیسٹ ہیمنگوے کے ناولوں پر کیا تھا۔

ان کی انسانی دنیا میں نہ صرف عورتوں کے بغیر مرد ہیں (عورتوں کے بغیر مرد ان کے انسانوں کے ایک مجموعے کا بھی نام ہے) بلکہ بغیر روزگار کے مرد ہیں۔ بغیر والدین یا بچوں کے مرد ہیں یا بغیر گھر بار اور طبقے کے مرد ہیں۔ — ۲۰

یعنی اس کے تمام کردار ادھورے سے نظر آتے ہیں مرد بغیر روزگار کے جنہیں عورتوں کی قربت حاصل نہیں ہے۔ عورتیں ہیں تو انہیں مردوں کا سہارا نصیب نہیں ہے۔ بچوں میں عدم تحفظ کا احساس بہت نمایاں ہے۔ ٹیڑھی لکیر میں بھی ہر کردار نامکمل اور نفسیاتی کش مکش کا شکار ہے۔ عصمت نے خود اس بات کا اقرار کیا ہے کہ ٹیڑھی لکیر کو لکھنے سے پہلے انہوں نے علم نفسیات پر بہت سی کتابیں پڑھیں تھیں تب کہیں جا کر دشمن کے کردار کی تخلیق کی مگر جہاں تک اس ناول کے بارے میں میرا خیال ہے عصمت نے جہاں علم نفسیات کی کتابیں پڑھیں وہیں نفسیاتی بیماریوں کا بھی اچھا مطالعہ کیا اور اپنے مطالعے اور مشاہدے سے ایک ایک بات کو نہایت سلیقہ کے ساتھ ٹیڑھی لکیر کے کرداروں میں سمو کر پیش کر دیا۔ یہ عصمت کا ہی قلم تھا۔ جو ٹیڑھی لکیر کے ہر کردار میں ایک بیماری کو بخوبی پردہ کر اور کچھ میں ایک سے زیادہ بیماریاں کو پیش کیا ہے۔ عصمت نے اس ناول میں جتنے بھی کردار پیش کئے ہیں ان میں نفسیاتی عوارض بھی پیش کئے ہیں اور وجوہات بھی بتانے کی کوشش کی ہے لیکن کہیں ایسا بھی لگتا ہے کہ عصمت بیماری کو پوری طرح سمجھ نہیں پاتی ہیں اور بیماری کو اچھے بھلے انسان میں

ٹھونس دیا ہے۔

بچوں میں، خاص طور سے لڑکیوں میں تحفظ کا احساس باپ کی طرف سے درشتی میں ملتا ہے۔ عموماً لڑکیوں میں آئیڈیل مردان کا باپ ہوتا ہے۔ فرائڈ اسے "ایڈ پیس" نامی پلکس" کہتا ہے۔ لیکن شمن کے والد ایک غیر فطری سا کردار ہیں، جس کو دس بچوں اور ایک جوان بیٹی کے بیوہ ہونے کے بعد بھی بچوں سے زیادہ اپنی بیوی کی ضرورت تھی۔ شمن کے ماں اور باپ کے پلنگوں کی پٹی سے پٹی جڑی رہتی تھی۔ جس کے نتیجے میں شمن کے کردار میں ایک کجی سی آجاتی ہے۔ خواہ اس کی وجہ ماں باپ کے پیار سے محرومی ہو یا گرم گرم آنکھ کے لمس کی جگہ دودھ کی بوتل کا آنا۔

بنیادی طور سے انسان دوسرے انسان سے لمس و لذت کا طلب گار رہتا ہے۔ شمن اس لذت سے شروع سے ہی محروم رہی۔ پہلے والدین کی عدم توجہی کی وجہ سے اور پھر آنا کے بچھڑ جانے کی وجہ سے اس کے بعد شمن کو ایک زبردست دھچکا منجھوٹی کی شادی پر لگتا ہے۔ کچی عمر کے پے در پے دھچکے شمن کے مزاج کی کجی کو جنسی کجروی میں بدل دیتے ہیں۔

عصمت نے اپنے اس بلند بانگ دعوے کے باوجود کہ وہ ماہر نفسیات فرائڈ وغیرہ کے فلسفہ سے قطعی متضاد نتائج برآمد ہونے والا ناول لکھ رہی ہیں وہ ٹیڑھی لکیر میں ہر مقام پر فرائڈ، ایڈلر اور یونگ کے نظریات سے اتفاق کرتی نظر آتی ہیں۔ یونگ کا نظریہ "ہم جنسیت"، عصمت چغتائی کا پسندیدہ موضوع ہے ان کے انسانوں (لحاف وغیرہ) میں جا بجا ان کے کردار اس علت کا شکار نظر آتے ہیں۔ ٹیڑھی لکیر میں یہ مرض اپنے عروج پر ہے اور متعدی بیماری کی طرح ایک کردار سے دوسرے کردار میں لگتا ہے نہ جانے کون سا کالج ہے جس کے زیادہ تر نسوانی کردار اس بیماری میں غوطے لگاتے ہیں وہاں لڑکیاں نہ صرف اپنی معشوق لڑکیوں کو کھلے عام تحفے تحائف دیتی ہیں جسمانی محبت کرتی ہیں بلکہ باقاعدہ لڑکیوں کا ایک طبقہ "مرنے والیوں" کے نام سے مشہور ہے۔

رسول فاطمہ LESBIANISM کی زبردست شکار ہے یہ شمن کی روم میٹ

تھی حالانکہ ہاسٹل میں لڑکیوں کو ساتھ سونے کی ممانعت تھی مگر رسول فاطمہ جاہتی تھی کہ وہ شمن کے ساتھ سوئے۔ ہزار بار شمن نے اس کو ڈھکیلا مگر وہ اپنا پلنگ شمن کے پاس کر کے ہی سوئی ایسا نہیں کہ صرف بڑی لڑکیاں ہی ایسی غلاظت میں لوٹا کرتی تھیں بلکہ ہاسٹل کی چھوٹی لڑکیاں بھی اس طرح کے بے ہودہ کھیل کھیلتی ہوتی پکڑی گئی تھیں۔

شمن کسی طرح رسول فاطمہ سے اپنی جان بچا کر اپنی دوست سعادت کے کمرے میں آجاتی ہے اُسے امید تھی سعادت بہت خوش ہوگی مگر سعادت کا رویہ اس کے برخلاف رہا۔ وہ شمن کو دیکھ کر خوش نہیں ہوتی ہے۔ کیونکہ یہاں سعادت اور نجمہ بھی اسی بیماری کی شکار تھیں یوں تو شمن کو سعادت اور نجمہ کی باتیں عجیب لگتیں اور جب ایک روز اس نے غور سے نجمہ کو دیکھا تو وہ کھل ہی تو گئی۔ نجمہ کا ذکر کرنے میں عصمت نے خود بھی کم مزے نہیں لئے ہیں جگہ جگہ لذت کا احساس ہوتا ہے۔ نجمہ کے ذکر کو پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا عصمت بھی غورت کے حسن میں دھنسی لیتی رہی ہیں۔

”ایک دن یونہی وہ شمن کے پاس ہی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ شمن پریشان ہو گئی اور جب اس نے اپنے دوپٹے کا آئینہ جھڑکا تو وہ شمن کے بازو پر آن گرا، شمن کو ایسا معلوم ہوا جیسے چھت پر سے اس کے اوپر سانپ ٹپک پڑا ہو۔ وہ سُن بیٹھی رہی۔“

جنسی جذبات کس طرح دھیرے دھیرے بڑھتے ہیں عصمت نے بہت خوبصورتی سے اور الفاظ تول تول کر بیان کیا ہے۔ شمن بھی انجانے میں اس غلاظت کی طرف بڑھ رہی تھی اور اس بات کا اس کو احساس بھی نہ تھا۔ مگر اس کے باوجود اسے نجمہ سے محبت اور سعادت سے نفرت ہونے لگی۔ کیونکہ سعادت جان بوجھ کر نجمہ کو شمن سے دور رکھتی تھی جس پر اسے بہت غصہ آتا۔ اور اب شمن بالکل عاشقوں کی طرح نجمہ کے کپڑے اس کا رنگ دیکھتی بکھرے ہوئے بال دیکھتی۔ اس کے کرتے کو جسم سے چپکا ہوا محسوس کرتی چونکہ سعادت نجمہ کو

چاہتی تھی اس لئے شمن سعادت کو اپنا رقیب محسوس کرتی ہے۔

شمن پر رسول فاطمہ مرا کرتی تھی اور اب شمن خود اس مرض میں مبتلا ہو گئی تھی نجمہ اور سعادت سے لڑائی ہونے پر وہ موقع دیکھ کر نجمہ سے ملنے جایا کرتی چونکہ عشق کے اظہار میں پہل کرنے کی ہمت نہ پڑتی اس لئے دونوں واپس خاموش آجاتی ہیں۔

جب شمن اسکول میں ہیڈ ماسٹرس بنی اس وقت بھی اس بیماری سے نجات نہ مل سکی تھی۔ اس کے آس پاس اس وقت بھی ایسے لوگ موجود تھے۔

اسی اسکول کی ٹیچرس میں ایک تھیں جس سارکس یہ اور اس کی ساتھی مسز شرمہا دونوں ہی آپس میں جنسی تعلقات رکھتی تھیں عصمت نے یہاں انکا ذکر کر کے یہ بات واضح کر دی ہے کہ زمانہ بدل رہا تھا سماجی حالات میں سدھار ہو رہا تھا اور تعلیم نسواں ترقی پر تھی مگر جنسی کجروی کا کوئی علاج نہ ہو سکا تھا گویا عصمت یہ ظاہر کرنا چاہتی ہیں کہ ملک کی سیاسی اور سماجی زندگی میں سدھار تو ہو رہا تھا مگر جنسی بے چینی اور نفسیاتی کمزوری ابھی بھی موجود تھی اس میں کوئی سدھار نہ ہوا تھا ناول کی کہانی جب پڑھتے پڑھتے امریکن اسکول میں پہنچتی ہے تو وہاں بھی ہمیں وہی فضا اور ماحول ملتا ہے۔ ناول کا ہر وہ کردار جس کا ذکر چند صفحات پر مشتمل ہے اس میں کچھ نہ کچھ جنسی کجروی ملتی ہے۔

اس طرح کا ایک کردار جو نفسیاتی کمزوریوں سے لبریز ہے ایلما۔ یہ شمن پر کافی اثر بھی ڈالتی ہے۔ اسے شادی سے نفرت ہے مگر مردوں سے پیار۔ اسے بچے تو چاہیے مگر شادی کے بغیر یہ عجیب و غریب کردار ایلما عیسائی ہے مگر اسے اپنے مذہب سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔ وہ کرشن کی تصویر کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بائبل کی آیتیں پڑھا کرتی تھی۔

یہ لڑکی شروع سے ہر بات میں ABNORMAL نظر آتی ہے۔ یہ منہ بھٹ زبان ڈاز ہے۔ مذہب سے بے گانہ بھی اور اپنی مرضی سے مذہب کی پابندی بھی کرتی ہے۔ ہر بات کو اپنے نظریے سے دیکھنا اور اس کا مذاق اڑانا اسے پسند تھا۔ ایلما کو عورت اور مرد کی باتیں زیادہ پسند تھیں۔ اور اسی وجہ سے کئی بار لڑکیوں نے اس کی شرکایت پر نپیل سے کر دی تھی اور پر نپیل نے اسے اسکول سے نکال دیئے جانے کی دھمکی بھی دے ڈالی تھی۔ مگر یونیورسٹی میں ایلما اپنی باتوں کی وجہ سے ہی ہر دل عزیز بن گئی تھی لڑکوں کے بارے

میں اس کے خیالات نہایت خطرناک قسم کے تھے۔ وہ اکثر شمن سے ان ہی باتوں کا ذکر کیا کرتی جنہیں شمن پوری طرح سمجھ ہی نہیں پاتی تھی سچ تو یہ ہے کہ وہ بھی اپنی باتوں کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر تھی۔ اسے سیتل سے نفرت تھی افتخار سے محبت مگر اسے نہ یہ معلوم تھا کہ محبت کیوں ہے اور نہ یہ معلوم تھا کہ نفرت کیوں ہے۔

عام طور پر بن بیاہی ماں بننے کا جب خطرہ ہوتا ہے تو بڑی سماج اور خاندان کے ڈر سے لڑکے سے شادی کرنے کی خواہش کرتی ہے مگر یہاں سیتل بار بار شادی پر زور دے رہا ہے اور ایلما اسے نیچا دکھانے کے لئے اس کے بچے کو گرانے کو تیار ہے۔ یہ کردار نئی اور پرانی روایت کے بیچ کس مکش میں مبتلا دکھائی پڑتا ہے۔ ایک جگہ تو وہ بغیر شادی کے افتخار کے بچے کی ماں بننے کی خواہش مند ہے۔ اور جب یہ خواہش غیر شعوری طور سے سیتل سے پوری ہو جاتی ہے تو وہ محسوس کرتی ہے کہ

”جسمانی طور پر تو میں واقعی بہت دن زندہ رہوں گی مگر میری روح مر چکی ہے۔“

جب ایلما کے بچے رولف کا انتقال ہو جاتا ہے تو شمن اسے شادی کرنے پر زور دیتی ہے۔ مگر وہ تیار نہیں ہوتی۔

”ایلما شادی کر ڈالو“ شمن نے سمجھانے کی کوشش کی۔

رولف پیدا کرنے کے لئے۔ تو پھر کیوں شادی نہیں کر لیتی؟ اس لئے کہ

مجھے ڈر تھا کہ میں رولف کے ساتھ پھر نا انصافی نہ کرنے لگوں۔ ماں بن کر

میں نے ڈان کے سے سلوک کئے۔“

شمن کی دوست ایلما سیتل سے نفرت کرنے کے باوجود اس کے بچے کی ماں بنتی ہے وہ کہتی ہے

”تم ان باتوں کو شاید عجیب سمجھ رہی ہو مگر میں کہتی ہوں کیوں کہ مجھے

سیتل سے نفرت ہے اور اُسے مجھ سے۔“

اس مرض کو نفسیات کی اصطلاح میں

می سوجنی " MISOGANY " کہتے ہیں جس کا مطلب

HATRED OF MARRIAGE ہے۔۔۔

اس نفسیاتی مرض کے شکار مریض جنسی جذبات تو رکھتے ہیں اور پورا بھی کرتے ہیں مگر شادی نہیں کرتے۔

جس طرح ایسا نفسیاتی الجھن میں مبتلا ہے اسی طرح اس کا بچہ جو سیتل کی نفرت کا نتیجہ تھا۔ وہ ہمیشہ سیتل کا بدلہ اس بچہ سے لیا کرتی۔ ایسا نے کبھی بھی رولف کو اپنے بیٹے کی طرح نہیں چاہا نہ ہی اس کی کوئی خواہش پوری کی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بچہ بغاوت پر اتر آیا اور ہر بات جو اس کی نہ پوری کی جاتی وہ بغاوت کر کے پوری کرانے کی کوشش کرتا۔

ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ اگر بچپن میں بچہ کو اچھا اور پرسکون ماحول نہ ملا تو بچہ بگڑ جاتا ہے۔ بچہ کا ہنسی ہونا، بد تمیز ہونا۔ جوش میں آکر بار بار جھنجھلانا اور بات بات پر بغاوت کرنا اس کے ماحول کی خرابی اور انسانی جبلت کی نا آسودگی کی نشاندہی کرتا ہے۔ ماں کی شفقت محبت اور نفرت کا اثر بھی بچہ کی ذہنیت پر پڑتا ہے۔ رولف کا کردار اس کی جیتی جاگتی مثال ہے اس کے برعکس ٹیڑھی لکیر میں منجھو کی ساس کا پوتا ہمیں ایک دوسری نفسیاتی الجھن کا شکار نظر آتا ہے۔ وہ دادی کے پیچھے پیچھے ہر وقت گھومتا ہے۔ اس میں محبت کی وجہ سے کئی کمزوریاں پیدا ہو گئی تھیں۔ کدّ نہایت ہی ڈرپوک صلح پسند اور سیدھا سادا تھا۔ شمن سے وہ ڈرا کرتا اور ہر وقت دادی کے پاس چپکار ہوتا۔ کدّ کو محبت زیادہ ملی تھی تو اس لئے وہ نہایت سیدھا اور شریف تھا اور شمن کو محبت کی کمی نے نہایت صندی۔ بد مزاج۔ بد تمیز اور لڑاکو بنا دیا تھا۔

زیادہ چاہت ملنے کی وجہ سے اکثر بچے احساس کمتری کے شکار ہو جاتے ہیں۔ ان میں خود اپنے اوپر سے بھروسہ اٹھ جاتا ہے۔ اور وہ ماں کا (یہاں دادی کا) اس قدر عادی ہو جاتا ہے کہ چند لمحے کی جدائی بھی برداشت نہیں کر پاتا۔

اس سے بچے خود اعتمادی۔ یقین ہمت کھو بیٹھتے ہیں اور سائے کی طرح چاہنے والے کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ کڈن دادی کے بغیر ایک پل بھی رہ نہیں پاتا۔
 ”کڈن دادی کے ساتھ ساتھ چولہے کے پاس بھی گھستا۔ یہاں تک کہ وہ رنج حاجت کو جاتی تو باہر کھڑا جلدی نکلنے کے تقاضے کرتا رہتا“ لے
 چونکہ کڈن کے گھر میں صرف دادی اور چچا تھے اس لئے کڈن کا دادی کی طرف کا جھکاؤ اوڈی پس کا مپلیکس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہاں کڈن بیٹے کی طرح ہے اور ماں کڈن کی دادی۔
 اسی طرح الیکٹرا کا مپلیکس کی مثال بھی بہت واضح ہے اس کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے۔

ELECTRA COMPLEX :-

“ — Attachment of daughter to father, with antagonism towards mother, and more or less a Counter-part of the oedipus complex — ” لے

یہ بھی فرائڈ کا نظریہ ہے اس الجھن کی عموماً وہی لڑکیاں شکار ہوتی ہیں۔ جن کے والد انہیں بہت زیادہ چاہتے ہیں ویسے یہ قدرتی بات بھی ہے کہ بیٹی ہمیشہ ماں سے زیادہ باپ کو چاہتی ہے۔ یہ چاہت ایسے موقع پر اور بڑھ جاتی ہے۔ جب ماں کا یا تو انتقال ہو گیا ہو یا پھر طلاق کے بعد لڑکی والد کے ساتھ رہ رہی ہو۔ اس نادل کے ایک عجیب و غریب کردار رائے صاحب کی اکلوتی بیٹی پریمیا (الیکٹرا کا مپلیکس) کی اچھی مثال ہے۔ پریمیارائے صاحب کی بیٹی اپنے والد سے اس قدر قریب اور بے تکلف ہے کہ حیرت ہوتی ہے ان کی باتیں، ان کی چھیڑ چھاڑ ان کی بے تکلفی اور محبت کرنے کے انداز سے صرف شمن کو ہی حیرت نہیں ہوتی بلکہ قارئین بھی حیران رہ جاتے ہیں۔ باپ بیٹی کی جسمانی چھیڑ چھاڑ کو دیکھ کر اور ہی گمان ہونے لگتا

۳۱	ص	عصمت چغتائی	ٹیرھی لکیر	لے
۵۱	ص	جیمس ڈرون	ڈکشنری آف سائیکا لوجی	لے

ہے لیکن یہ دونوں کردار اس معاملے میں اب نارمل ہیں۔ پریما الیکٹرکا میلکس کی ایک اچھی مثال ہے۔

مختلف نفسیاتی بیماریوں میں ایک بیماری ایسی بھی ہوتی ہے جس میں انسان بات بات پر روتا ہے۔ بہت دیر تک منتیں کراتا ہے۔ ایسا شخص خاص طور پر اپنے چاہنے والوں کے سامنے زیادہ روتا ہے چاہے وجہ اہم نہ بھی ہو مگر وہ روئے گا ضرور اسی مرض میں مبتلا ایک کردار مسز سارک، میں جو نفسیاتی عارضے Epiphora میں مبتلا ہیں۔

Epiphora -

“ — An abnormal overflow of tears, due usually to an obstruction of the tear duct. . ۱

” دوسری مسز سارک عجیب پٹی ہوئی روئی سی ادھیڑ عمر عورت تھیں۔
ذرا سی بات پر پھوٹ کر رو پڑتیں اور پھر گھنٹوں مناؤنے کر داتیں ایک
دوست مسز شدھا ہر اسکول میں ان کے ساتھ رہنے کی خدمت انجام
دیتی تھیں۔“ ۲

مسز سارک بہت تھوڑے سے وقفے کے لئے ناول کے صفحات پرا بھرتی ہیں مگر اس کے
بادجود ان میں Epiphora جیسی نفسیاتی بیماری کی جڑیں پوری طرح موجود ہیں۔
اسی طرح ناول میں کئی کردار احساس کمتری اور کئی کردار احساس برتری کے شکار ہیں۔ اس
کی اچھی مثال انجماز اور عباس ہیں۔ احساس کمتری کے وہ لوگ شکار ہوتے ہیں جو اپنی
 کمزوری کو سمجھنے کے باوجود اسے چھپانا چاہتے ہیں۔ احساس کمتری کی تعریف اس طرح
بیان کی گئی ہے۔

INFERIORITY COMPLEX :-

A complex arising from Conflict between the impulse to seek recognition (positive self impulse) and feel of the heart arising from frustration frequently experienced in similar situations in the past resulting in defensive, compensatory, or often aggressive behaviour unconsciously determined must not be confused with inferiority feeling: —^۱

اعجاز شمن کی خالہ کا لڑکا تھا چونکہ باپ کے انتقال کے بعد والدہ نے دوسری شادی کر لی تھی اور نئے والد کسی جلا د سے کم نہ تھے اس لئے ان کے عذاب سے بچنے کے لئے وہ شمن کے گھر رہنے کے لئے آگیا تھا۔ اعجاز زبردست قسم کی احساس کمتری کا شکار تھا۔ نہ اسے بولنا آتا نہ بات کرنا۔

۲ وہ عموماً چپ چاپ الٹی طرح بیٹھا بولنے والوں کے ہونٹ تکا کرتا شرارت تو وہ کرنا جانتا ہی نہ تھا۔ لوگ ارمان کرتے ہیں کہ ان کے بچے شریہ نہ ہوں مگر اعجاز کو دیکھ کر وہ بھی کانپ اٹھتے، وہ بالکل مار کھائے ہوئے بندر کی طرح ایک جگہ بندھا چاروں طرف آنکھیں دوڑایا کرتا۔ اس کی آنکھیں ایک ہی وقت میں بھوکی، ندیدی اور متحیر نظر آتیں، ۳ اس لڑکے سے سوائے اس کی ماں کے اور کوئی محبت نہ کرتا حالانکہ وہ بہت فرماں بردار اور بے زبان تھا بغیر جین چرا کئے ہوئے دوسروں کا کام کرتا۔ مرغیوں کو دان اڈالنا۔ کتے

کو بچا ہوا کھانا ڈالتا اور دوڑ دوڑ کر سبھی کام کرتا۔
 اب جو یعنی اعجاز اس قدر احساس کمتری میں مبتلا تھا کہ اس میں خود داری نام کو باقی نہ
 گئی تھی وہ بڑے آرام سے کوئی بھی غلط سے غلط کام جھوٹے کھانے کے بدلے میں کرنے کو تیار
 رہتا گویا اس کی حس ماری گئی تھی اور وہ جذبہ جو ایک باشعور بچے میں ہوتا ہے ”برا لگنے کا“
 اس میں نام کو نہ تھا۔

یونگ کی طرح فرائڈ کے ہم عصر ماہر نفسیات اور شاگرد ایڈلر
 نے بھی بعض جگہ فرائڈ سے اختلاف کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انسان
 اپنی ذہنی یا جسمانی کمتری کو دور کرنے کے لئے تلافی طریقہ کار
 Compensation Method پر عمل کرتا ہے۔ ایڈلر کے خیال
 کے مطابق انسانی زندگی میں اولین رد عمل کمتری کا ہوتا ہے۔ جسم کی
 کسی عصبی کمتری کے باعث دوسرا عصبی زیادہ نشوونما پا کر اس کمتری
 کی تلافی کر لیتا ہے۔ — ” لے

اس ناول میں اب بھی اسی Compensation Methods کے تحت اپنے آپ
 کو بدل لیتا ہے اور کافی سال بعد جب وہ تعلیم حاصل کر کے واپس آتا ہے تو اس کی
 کا یا ہی پلٹ چکی ہوتی ہے۔

اعجاز وہ لڑکا جو شمن کا ایک لمس پانے کے لئے گھنٹوں پانی پینے کا بہانا کیا کرتا
 تھا اور آخر جب شمن نے اسے بالکل ہی نہ گردانا تو وہ شمن کا ایک جوتالے کر بخار میں مبتلا
 رہا تھا آج وہی لڑکا شمن سے اس کے بدلے اس کی دوست بلقیس کا ہاتھ مانگ رہا تھا۔
 اس نے دولت عزت حاصل کر لی تھی۔ اور اب اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کی خواہش
 کا اظہار کر کے وہ احساس برتری کو تسکین پہنچا رہا تھا۔

جس طرح احساس کمتری ایک نفسیاتی روگ ہے اسی طرح احساس برتری
 بھی ایک نفسیاتی بیماری ہے، ہر شخص میں احساس برتری کا مادہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی

صورت میں پایا جاتا ہے۔ احساس برتری کا یہ جذبہ صاف اور سیدھے طور پر لوگ نہیں مانتے تو یہی جبلت مختلف طریقوں سے آسودہ ہونے کی طاقت رکھتی ہے اور اپنی تسکین کے لئے نئے نئے پیرائے ڈھونڈ سکتی ہے۔ احساس برتری انسان سے بلند کام بھی کروا سکتی ہے اور ذلیل بھی کر سکتی ہے۔

SUPERIORITY FEELING :-

Exaggerated self-valuation. not infrequently appears as a reaction or defence against an inferiority or inferiority complex.

طیڑھی لکیر کے چند کردار جیسے عباس اس کے والد والدہ سمجھی احساس برتری کے شکار ہیں۔ عباس ان کا اکلوتا بیٹا انگلینڈ سے انجنیری پاس کر کے آیا تھا عباس کے والد میں اسی وجہ سے احساس برتری پیدا ہو گئی تھی اور وہ صاف صاف دیواروں پر پاں کھا کر پیک تھوک کر اپنی احساس برتری کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

عباس کا ہر لڑکی سے محبت کا دعویٰ اس کی احساس برتری کو ظاہر کرتا ہے کیونکہ دم بہ اچھی طرح سے سمجھتا تھا کہ وہ جس لڑکی کو چاہے گا حاصل کر لے گا اور یہی خیال اسے اس طرح کی حرکتیں کرنے پر اکاتا بھی ہے۔ عباس ایسی چھپھوری عشق بازی کے ذریعہ "احساس برتری" کی تسکین حاصل کرتا ہے۔

عصمت چغتائی نے مردوں کی کئی قسموں کا بیان بالکل آم کی قسموں کی طرح ایلما کی زبان سے کر دیا ہے۔ مردوں کی ایک خاص قسم ایسی بھی ہوتی ہے جو عورتوں سے بہت زیادہ مانوس ہوتی ہے یہ لوگ غیر معمولی طور پر عورت کے پرستار۔ عیاش اور مکار ہوتے ہیں۔ ان کا کام دوسرے جو بیوی کے ہوتے ہوئے اور وہ سے عشق لڑاتا ہے اور بھولی بھالی لڑکیوں کو پھنساتا ہے علم نفسیات میں اس طرح کے لوگوں

کے لئے ایک خاص الفاظ استعمال کیا جاتا ہے "SATYRIASIS" جس کی تعریف کچھ اس طرح ہے۔

SATYRIASIS:-

SEXUAL INSANTLY OR. AN EXAGGERATED

SEXUAL DESIRE IN HUMAN MALES.

افتخار کی شخصیت شاندار اور بڑی رعب دار تھی کالج کے پریسیڈنٹ ہونے کے ناطے اس کا خوب رعب رہتا۔ پہلے وہ مس بوگا کو اپنے جال میں پھنسائے تھا یا یوں کہے مس بوگانے افتخار کو پھنسا یا تھا اس کے بعد ایلیما کا افتخار سے عشق چلا اور بات یہاں تک آگئی کہ ایلیما اپنا پہلا بچہ افتخار سے ہی چاہنے لگی۔

افتخار شمن کے بھولپن معصومیت اور سیدھے پن سے کس طرح فائدہ اٹھاتا ہے اس کے جذبات کو اکساتا ہے۔ اپنی محبت کا اقرار اس انداز سے کرتا ہے کہ شمن اس کو اپنا سچا عاشق محسوس کرتی ہے۔ اس طرح افتخار شمن کو محبت کے نام پر بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس نے شمن کے دل پر قبضہ کرنے کے لئے اس سے ایسی مکاری کی باتیں کیں کہ جس لڑکی نے اس دنیا کو قریب سے نہ دیکھا ہو وہ یقیناً پھنس کر رہ جاتی۔ افتخار نے شمن کو اپنی زندگی کی بھولی بسری باتیں اس انداز سے سنائیں کہ وہ اور زیادہ افتخار کے قریب ہو گئی۔

افتخار شادی شدہ تھا وہ کئی بچوں کا باپ تھا مگر جب شمن اس سے شادی کے بارے میں پوچھتی ہے تو نہایت چالاک اور مکاری کے ساتھ شادی کی بات اڑا جاتا ہے اس معاملے میں اس کی چرب زبانی اور فرہانت اس کے کام آتی ہے۔

افتخار حالانکہ شادی شدہ تھا اور یہ خوب سمجھتا تھا کہ شمن چاہے جتنی تیز ہو اسے مردوں کے بارے میں ذرا بھی جانکاری نہیں ہے۔ وہ خوب سمجھ بوجھ کر باقاعدہ پلاننگ کے ساتھ شمن کو اپنے جال میں پھنساتا ہے، اس سے اپنے لئے پیسے

منگواتا ہے۔ دواؤں کے لئے پیسے لیتا ہے اور نہ صرف وہ بلکہ اس کی بیوی بھی شمن کے خطوط کی بنیاد پر شمن کو بلیک میل کرتی ہے۔

ان کرداروں کے علاوہ ٹیڑھی لکیر کے چند دیگر کرداروں میں "LUST" نام کی نفسیاتی بیماری پائی جاتی ہے یہ بھی کردار ضرورت سے زیادہ جنسی خواہش اپنے اندر رکھتے ہیں اور اسی زیادتی کی وجہ سے وہ جنسیاتی تکریدی کے شکار بھی ہو گئے ہیں۔ Lust نفسیات میں Sexual desire or appetite کو کہا جاتا ہے، لہ ٹیڑھی لکیر کے کرداروں میں بوگا۔ سینٹل۔ بلقیس، رضیہ بیگم۔ رائے صاحب شمن کی بڑی آپا۔ رشید۔ منجھو بی۔ آپا کی دوست عزیز بیگم اور شمن کے والدین وغیرہ اس بیماری میں مبتلا ہیں۔

ٹیڑھی لکیر کی ہیر وئن شمن کے کردار کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یقیناً یہ کردار نفسیاتی الجھنوں و نفسیاتی بیماریوں کا مجموعہ نظر آئے گا۔ شروع سے لیکر آخر تک اس کردار میں نئی نئی نفسیاتی بیماریاں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ شمن اس ناول کا واحد کردار ہے جو نفسیاتی بیماریوں کا خزانہ سمجھا جاسکتا ہے۔ عصمت نے اس کردار کے بارے میں ایک انٹرویو میں کہا کہ

”یہ ناول جب میں نے لکھا تو بہت بیمار تھی اور گھر میں پڑی رہا کرتی تھی اس لئے اس ناول میں میرا جی بہت لگا میں لیٹے لیٹے لکھتی یا لکھواتی تھی اس ناول کی ہیر وئن ”شمن“ قریب قریب بیٹھائے ہوں بہت سی باتیں اس میں میری ہیں ویسے آٹھ دس لڑکیوں کو میں نے اس کردار میں جمع کیا ہے اور ایک لڑکی کو اوپر سے ڈال دیا ہے۔ جو میں ہوں۔ اس ناول کے حصوں کے بارے میں صرف اتنا بتا سکتی ہوں کہ کون سے حصے میرے ہیں اور کون سے دوسروں کے۔“ ۱۵

اس میں عصمت نے نہ صرف الگ الگ لڑکیوں کے کردار ڈالے ہیں بلکہ طرح طرح کی نفسیاتی

انجھنوں کو ایک خاص عمر کے ساتھ پیش کیا ہے، شمن ایک ایسے گھر کی آخری اولاد ہے جس کو ناپا یا جاتا ہے نہ اس پر توجہ دی جاتی ہے بچپن سے ہی اسکو اپنے اکیلے پن کا احساس ہو جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کے اندر طرح طرح کے نفسیاتی عوارض پیدا ہو جاتے ہیں۔

کسی بھی لڑکی کا اپنی کسی ہم جنس سے محبت کرنا "SAPPHISM" کہلاتا ہے۔

جس کی تعریف کچھ اس طرح کی گئی ہے۔ "Erotic Attachmant between women" شمن کو چونکہ اپنے گھر میں کسی کی محبت نہ مل سکی تھی اس وجہ سے جیسے ہی اسے کوئی چاہنے والا ملتا وہ اسے جی جان سے چاہنے لگتی، انا اور منجھو بی سنے بچھڑنے کے بعد اسے مس چرن ہی ایسی ہستی دکھائی دی تھیں اور بہت جلدی وہ ان کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ ہم جنسیت کے اسباب کے بارے میں داکٹر لکھتا ہے۔

"ہم جنسیت کے اسباب کے بارے میں ماہرین میں آج تک

اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعض ماہرین وراثت پر زور دیتے ہیں

تو بعض ماحول اور تربیت پر اصرار کرتے ہیں۔ غالباً حقیقت یہ ہے کہ

موروثی اور ماحولی دونوں عناصر لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دونوں عناصر کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ بچے میں پیدائش

کے وقت ایک ایسا قدرتی رجحان ہوتا ہے جو اسے اس قسم کی جنسی گراہیوں

کی طرف لے جاتا ہے، جبکہ اس کی تربیت بھی نامناسب ہو۔" لہ

شمن میں چاہے جانے کار جحان ضرور تھا کیونکہ ہر بچے کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ چاہا جائے اس پر توجہ دی جائے اور جب یہ چاہت کی خواہش پوری نہیں ہوتی تو وہ کہیں بھی کسی سے بھی محبت کرنے لگتا ہے جو اسے کھوڑا سا بھی سہارا دے۔

"اس کی زبان پر ہر وقت مس چرن کا نام رہنے لگا۔ لڑکیوں

نے اسے چھیڑنے کی کوشش کی جس سے بجائے کم ہونے کے ان کا خیال

ایک رومانی چیز بن کر اس کے دماغ پر چھانے لگا مس چرن کو دیکھ کر

آپ ہی آپ اس کا دل ان کی طرف کھینچنے لگتا۔ وہ کہیں بھی ہوتیں اسے ان کے وجود کا احساس نبض کی طرح دھڑکتا، اپنی رگ دپے میں ہر ایت کو تپا ہوا معلوم ہوتا وہ اگر سامنے سے گزر جاتیں تو شمن جو کام کرتی ہوتی اسے گڑ بڑ کر دیتی۔ بات کرتی ہوتی تو زبان لڑکھڑا جاتی۔ اگر وہ کسی اور درجہ کو کوئی کھیل کھیلاتی ہوتی تو اس کے لئے پڑھنا دشوار ہو جاتا۔ رہ رہ کر ان کے قہقہے اُسے سر سے پیر تک لرزادیتے۔ — ”

شمن کو چونکہ بچپن میں ماں کی محبت نہ ملی اس کی ماں نے صرف اسے پیدا کیا تھا روتی بلکتی شمن کو انا کے پاس ڈال دیا گیا مگر انا کو بھی شمن سے صرف اتنی دلچسپی تھی کہ شمن کو پالنے کا اسے پیسہ ملتا تھا۔ وہ روتی رہتی انا اپنے عاشق عے عشق لڑاتی رہتی اس کے بعد نا تجربے کا زہن منجھوبی کو اس پر ترس آ گیا۔ مگر بچہ پیدا کرنے سے پہلے کوئی ماں نہیں بن سکتا لہذا یہاں بھی شمن محبت اور ممتا کے لئے پیاسی ہی رہی محبت اور ممتا کے لئے ترستی شمن جب مس چرن کے قریب آتی ہے تو وہ انہیں دل و جان سے چاہنے لگتی ہے۔ ان کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار رہتی ہے مس چرن سے شمن کا لگاؤ اور محبت اسی پیرائے میں آتا ہے۔

علم نفسیات کے مطابق ”MASOCHISM“ ساکیت اور سادیت
 ”SADISM“ دو ایسے امراض ہیں جن میں انسان دوسروں کو اور اپنے آپ کو تکلیف پہنچا کر سکون حاصل کرتا ہے۔

MASOCHISM:-

pleasure particularly sexual pleasure
 in suffering physical pain, interpreted
 psychoanalytically, terms of the des-
 tructive or death instincts, eroti-

۱۔ "cally bound. —"

ناول کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شمن کو جہاں دوسروں کو تکلیف پہنچا کر سکون ملتا ہے وہیں خود اپنے آپ کو بھی تکلیف پہنچا کر لذت اور سکون حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی کامیابی پر مسکراتی ہے۔

"یہاں تک کہ ایک دن اس نے کوئی معقول بہانہ نہ پایا تو کچھ سے بلیڈ سے اپنا پیر کاٹ لیا اور بڑی دیر تک اپنی کامیابی پر مسکراتی رہی۔ —" ۲

صرف یہی نہیں کہ اپنے سے ہی اپنے کو تکلیف دے کر وہ خوشی محسوس کرتی بلکہ اسے منجھو نے بہت دنوں بعد سسرال سے آنے کے بعد مارا تو اسے بہت خوشی محسوس ہوئی۔ "منجھو نے کس کس کے دو گھونٹے جملے شمن پھوٹ پڑی دکھ سے نہیں ان توجہ بھرے گھونٹوں کی لذت سے اس کا جی دکھ اٹھا۔"

منجھو کے گھونٹے کی شیرینی جس کے لئے وہ ترس گئی تھی اس کی رگ رگ میں تیر گئی۔ اور پھر گھونٹوں تھپڑوں اور چانٹوں نے نہ صرف اس کے جسم پر سے بلکہ روح پر سے بھی میل کا غلاف اتار دیا۔ —" ۳

یہ سادیت کی اچھی مثال ہے ٹھیک اسی طرح کی مثال بیدی کے اکلوتے ناولٹ ایک چادر میلی سی میں بھی ملتی ہے۔ جب منگل رانوں کو مارتا ہے بجائے اس کے کہ وہ روتی افسوس کرتی کہ آج اس کا نیا شوہر بھی وہی سب حرکت کر رہا ہے جس کے خلاف اس نے آواز اٹھائی تھی وہ خوش ہوتی اور بھولی بھری میٹھی یادوں میں کھو گئی۔

۱۶۴	ص	جیمس ڈرون	۱۔ ڈکشنری آف سائیکالوجی
۷۸	ص	عصمت چغتائی	۲۔ ٹیڑھی لکیر
۳۴	ص	عصمت چغتائی	۳۔ ٹیڑھی لکیر

شمن کو جب بھی غصہ آتا وہ اس کا اظہار نہ کر پاتی یا اپنی تسکین نہ کر پاتی تو بیٹھے بیٹھے وہ اپنے خیالات کی تکمیل کر لیتی ہے۔ اس وجہ سے اُسے دن میں خواب بھی آنے لگے۔ یہ بیماری خاص کر ان لوگوں کو ہوتی ہے جو موجودہ حالات سے خوش نہیں ہوتے یا جن کی خواہش پوری نہیں ہو پاتی ایسے لوگ DAY DREAMING کرنے لگتے ہیں یعنی بیٹھے بیٹھے خواب کی دنیا میں کھو جانا۔ سائیکالوجی میں اس کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے۔

DAY DREAMING:-

Type of phantasy, in which the individual allows his mind to wander aimlessly among pleasant imagery gratifying wishes ungratified in real life — ۱

شمن اس مرض میں بھی مبتلا ہے۔ وہ دن میں بار بار طرح طرح کی بیوقوفانہ خواب دیکھتی ہے جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں اور جن میں اس کی خواہشات چھپی ہوتی ہیں۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

”اور پھر وہ سوچنے لگی۔۔۔۔۔ اس نے گڑھا کھود کر منجھو کی ساس کو بودیا ہے۔۔۔۔۔ دوسرے دن کلا پھوٹ رہا ہے۔۔۔۔۔ بھورا بھورا چتیوں دار۔۔۔۔۔ سپیرے ٹوکریوں میں اڑ رہا لے پھرتے ہیں نا۔ بالکل ویسا۔۔۔۔۔ شمن خوشی سے دیوانی دیکھ دیکھ کر مری جا رہی ہے، پھر وہ بڑھتا بڑھتا نیم کے پیڑ سے بھی اونچا ہو گیا اور نمکولیوں کی طرح کچے کے کچھے مر گھلی سڑی ہوئی گڑی بڑھیوں کے لٹکنے لگے۔ ایک لمبا سا بانس لے کر وہ انہیں جھاڑنے لگی جیسے پکی پکی املیاں۔ سارا آئین بڑھیوں سے پیٹ گیا، ہزاروں لاکھوں کھانسی۔ چھینکتی بڑھیاں۔ کوئی پان دان کھولے جلدی جلدی پان لگا رہی ہے، کوئی چوکی پر بیٹھی چھالیا کتر رہی ہے۔ آٹھ دس

بادرچی خانے میں گھسی ہنڈیوں کا ناس مار رہی ہیں، دو چار اچار کی مٹکوں کے پاس پھٹک رہی ہیں، مٹی مٹی مٹکڑیوں کے برابر بڑھیاں سارے گھر میں اودھم جوت رہی ہیں اور وہ ایک دم اُن بڑھیوں سے گھبرا اٹھی اور دونوں ہاتھوں سے انہیں دور دور کرنے لگی۔ —

یہ خواب نہ صرف اس کی تشنہ خواہش کو پورا کرتا نظر آتا ہے بلکہ اس کے دل میں بڑھیا کے لئے جس طرح کے جذبات تھے اس کا اظہار بھی ہو جاتا ہے۔

جس طرح دن میں بیٹھے بیٹھے کھلی آنکھوں سے خواب دیکھنا ایک کمزوری ہے ایک بیماری ہے ٹھیک اسی طرح رات میں ڈروانے خواب دیکھنا اور پریشان یا خوف کی حالت میں بیدار ہونا۔ دوڑنے بھاگنے۔ چیخنے چلانے اور پریشانی کا خواب دیکھنا بھی نفسیاتی مرض ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے جب انسان اپنی پریشانی اور دوسرے کہتا نہیں اور وہ باتیں اس کے دماغ میں پکٹی رہتی ہیں۔ اس بیماری کو "NIGHT TERRORS" کے نام سے جانا جاتا ہے اور اس کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے۔

"Very disturbing or frightening dreams from which the individual wakes in a state of terror —"

"NIGHT TERRORS" کی کئی اچھی مثالیں ٹیڑھی لکیر میں موجود ہیں۔ شمن اکثر جگہ اس بیماری میں مبتلا نظر آتی ہے۔

"رات بھرا سے عجیب عجیب داہے خواب بن بن کر سنا تے رہتے، کبھی کالج کے غنڈے اُسے چیختے چلاتے اپنے پیچھے دوڑتے دکھائی دیتے۔ کبھی دیکھتی وہ شیشے جیسے چکنے پہاڑ پر الٹی پھسل رہی ہے۔ اور اس کے کپڑے تار تار ہو گئے ہیں۔ ہتھیلیاں چھل گئی ہیں! کبھی دیکھتی میٹن چھوٹے بھنگی کی پیٹھ پر سوار اسے جھاڑو سے بانک رہی ہے، وہ غسل خانے میں

ہنہار ہی ہے کہ جیٹی نژاد نرس نے چوپٹ دروازے کھول دیے۔ وہ چیخا
کر گڑی مڑی ہو گئی۔ ” — ۱۴

” ایک دن وہ پڑھتے پڑھتے میز پر سر ڈال کر سو گئی۔
دیکھا رائے صاحب کے ساتھ بیٹھی تاش کھیل رہی ہے کہ ایک دم سے
وہ اٹھ کر ناچنے لگے انجے باز دوں کے پٹھے پھول پھول کر اچھلنے لگے اور
بال گزر گزبھر کے سانپوں کی طرح کھڑے ہو کر جھومنے لگے۔ مصنوعی دانت
سرتال میں بجنے لگے۔ تاشوں کے پتے مشعل کی طرح جل اٹھے
اور وہ شمن کی طرف بڑھے۔۔۔۔۔ اس نے ایک دل دوز چٹخ ماری
لیکن انہوں نے اس کی آنکھوں میں آگ ٹھونس دی۔ شمن متواتر چیخیں مارتی
رہی اور دونوں ہاتھوں سے مشعل کے شعلوں کو آنکھوں سے دور ہٹاتی

رہی۔ ” — ۱۵

شمن کا ڈراؤنہ خواب دیکھنا خوف کی حالت میں چیخنا پلانا اور ڈر کر خوفزدہ ہو جانا اس کی
ذہنی کمزوری کی علامت ہے جسے عصمت چغتائی نے بڑی ہنرمندی سے بیان کیا ہے۔
شمن میں ان بیماریوں کے علاوہ کچھ اور نفسیاتی بیماریاں بھی موجود ہیں۔ ایک
نفسیاتی بیماری ” KLEPTOMANIA ” یہ بھی شمن میں موجود ہے۔

— “ An obsessive ^{impulse} ~~in~~ bulse to steal, not infre-
quently shown in stealing objects for which
the individual has no desire — ” ۱۶

ہم دیکھتے ہیں کہ نادل جس طرح قدم قدم آگے بڑھ رہا ہے اسی طرح اس
کردار کا ٹیڑھا پن اجاگر ہوتا جا رہا ہے۔ طرح طرح کی مجروری اس کردار کو ٹیڑھے سے ٹیڑھا

۱۷۶	ص	عصمت چغتائی	۱۷	ٹیڑھی لکیر
۲۰۵	ص	عصمت چغتائی	۱۸	ٹیڑھی لکیر
۱۵۱	ص	جیمس ڈرون	۱۹	ڈکشنری آف سائکالوجی

بنارہی ہے۔ اسی ٹیڑھے پن میں ایک اور اضافہ ہوتا ہے۔

”KLEPTOMANIA“ سے انسان جب تعلیم حاصل کرتا ہے تو عام طور سے اچھے سے ادراچھا اور برے سے اچھا بننے کی کوشش کرتا ہے مگر اس کے برخلاف کچھ لوگ صرف برائی حاصل کرتے ہیں اور ایسے لوگ اچھائی کی طرف سے آنکھیں موند لیتے ہیں یا انہیں اچھائی نظر ہی نہیں آتی۔ شمن بھی اسی طرح کی ہے۔ جب وہ پہلی بار ہاسٹل رہنے جاتی ہے تو واپس آنے پر کئی طرح کی اور بری عادتیں اس میں آگئی تھیں بغیر مزدورت چوری کرنا ان میں سے ایک تھا۔

”اس کے علاوہ اُسے کھانے کی چیزیں چرانے کی بڑی مہارت ہو گئی تھی۔ ادھر ادھر دیکھ کر وہ جھٹ نعمت خانے میں سے کچھ نکال کر منہ میں رکھ لیتی اور ایسے مزے سے تھوڑا سا چرا کر لعل میں دبا لیتی کہ خوب خوب ہاتھ ہلا ہلا کر چلتی جب بھی کسی کو پتہ نہ لگتا اور منہ میں لقمہ لے کر وہ گنگنائی ہوئی کھلی جاتی تاکہ کوئی سوچے اس کا منہ خالی ہے۔ اس کے علاوہ پیسے اور روپے تک اڑا لیتی مگر کسی کو اس کی طرف شبہ کرنے کا خیال بھی نہ آتا۔ چوری کی چیز وہ نہایت تن دہی کے ساتھ سب کے ساتھ مل کر ڈھونڈتی۔ یہ طریقہ اس کی بے گناہی کو اور مضبوط بنا دیتا۔“

نفسیاتی بیماریوں میں ایک بیماری ”REVENGE“ بدلہ لینا بھی ہے۔ یعنی انتقام کا جذبہ۔ اس کے تحت انسان میں اپنی بے عزتی اور کمزوری کا بدلہ لینے کی زبردست خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ شخص کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی روپ میں بدلہ لے ہی لیتا ہے۔ شمن شروع سے آخر تک لوگوں سے اپنی بے عزتی نا انصافی اور بدکلامی کا بدلہ لیتی رہتی ہے۔

”REVENGE“ کی تعریف یہ ہے۔

”REVENGE“:-

“ Deliberate infliction of injury upon others Individuals or groups, from whom injury has been received ” — ۱

منجھو بی کی مار تو شمن نہ لیتی تھی مگر ادھر کچھ دنوں سے اس کا بھی جی چاہتا کہ وہ منجھو کو خوب مارے

”..... پھر تخیل میں ہی وہ منجھو بی کو پیٹنے لگتی۔ دو تھپڑ گال پر مار کر اس کے

کپڑے اتار ڈالتی اور ہنسلانے لگتی۔ اس وقت اُسے کہیں سے اپنی بھولی

بسری انا کا دھندلا سا خاکہ یاد آجاتا اور اس کا جی بھر آتا اور غصہ چڑھتا اور

وہ منجھو کے سر پر بیسن ڈال کر خوب گھسے لگاتی زور زور سے جھانوی

سے اس کی کہنیاں اور گٹے چھیلنے لگتی پھر کھر درسا تو لیہ لے کر اتار گرتی کہ

منجھو کی کھال اتر جاتی اور ناک لال چقندر ہو جاتی ایک کان کی لوٹوٹ

کر تو لیہ ہی میں الجھ آئی۔۔۔ ۲

اسی طرح شمن نے رسول فاطمہ سے اس کے کیئے کا بدلہ لیا۔

”وہ چپکے سے اٹھی اور آہستہ سے نماز کے کمرے کی کنڈی

اپنے کمرے میں..... رسول فاطمہ نے چونک کر اُسے

پکارا ”شمن..! مگر وہ تیز تیز قدم چل پڑی..... کمرے میں پہنچ کر اس

کا دل آزاد چڑیا کی طرح ہلکا پھلکا ہو گیا۔۔۔۔۔ پلنگ پر لیٹ کر وہ خاموش

دبے ہتھوں میں ڈوب گئی۔۔۔ ۳

موسم میں رسول فاطمہ کو نماز کے کمرے میں بند کر دینا اس کے بدلے کے جذبات کو پیش کرتا ہے۔

اپنی زندگی کا دوسرا بدلہ شمن نے اس وقت لیا جب اس کا بچن کا منگیت شمن کی

دوست بلقیس سے شادی کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے مگر پھر شمن کی شادی کی بات

۲۵۱	ص	جیمس ڈرون	ڈکٹری آف ساکالوجی	۱
۲۰	ص	عصمت چغتائی	ٹیڑھی لکیر	۲
۸۹	ص	عصمت چغتائی	ٹیڑھی لکیر	۳

ابو سے چل نکلتی ہے۔ شمن اعجاز عن ابو سے بدلہ شادی سے صاف انکار کر لیتی ہے۔

”اس نے نوری سے کہہ دیا کہ وہ اعجاز کے علاوہ ہر جانور سے شادی کر سکتی ہے، جھگڑے اُٹھے، کچھ رونے دھونے کے ڈھونگ رہے مگر کالچ جا کر اس نے صاف صاف انکار لکھ دیا۔ اور اس قدر بے حیائی سے کہ یہ سانحہ خاندان میں تاریخ بن گیا..... زور لگا کر اس نے ہر گرفت سے پھسلنا شروع کیا بغاوت! اس کی رگ رگ غور سے پھڑک اُٹھی اُسے خود اپنی طاقتوں پر حیرت ہونے لگی۔ اس نے سب کے منہ پر طمانچہ مار دیا، دل توڑ دیئے امیدیں خاک میں ملا دیں، اور کتنی ظالم تھی وہ؟“

یقیناً شمن کی بڑی آپا نے اس کی زندگی میں زہر گھولا تھا۔ جب وہ بیوہ ہو کر گھر آئیں ہیں تو سب سے زیادہ مصیبت شمن پر ہی ٹوٹتی۔ وہ بات بات پر شمن کو ذلیل کرتیں اسے ڈانٹتیں اور مارتیں اس کا بدلہ شمن نے ان کی کیاری کو تباہ کر کے لیا۔

”بڑی آپا کی کیاریاں!، آنا فانا میں وہ بھو کی شیرنی کی طرح

ہری بھری کیاریوں پر پل پڑی۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے کھسوٹنا

شروع کیا جیسے وہ اپنے کسی دشمن کی آنتیں نکال رہی ہو اور پھر مٹھیوں

میں لیکر اس نے زمین پر رگڑ ڈالا۔ مچوں کے پیڑ۔ لوکی کی بیل، چمیلی اور

موگرے کے پودے جس میں سے روز پھول توڑ کر آیا جوڑے میں لگایا

کرتی تھیں توڑ موڑ کر پیروں سے مسل ڈالے۔ اب اسے ہنسی آنے لگی“

اس طرح اس نے ہر اس انسان سے بدلہ لیا جس نے اس کا ذرا سا بھی دل دکھایا تھا۔

بعد کی زندگی میں اس نے انقلابی شاعر۔ کامریڈ صمد اور ٹیلر وغیرہ سے بدلہ لے کر

اپنی انتقام کی آگ بجھائی۔

سادیت اپنے ادائی اظہار میں جنسی بے راہ روی کا ایک عام وقوعہ نظر آتی ہے سادیت کی تعریف ہم یوں کر سکتے ہیں: احساس لطف (انتہائی ہیجان) کا ایسا تجربہ جو اوپر یاد دوسروں (انسانوں یا جانوروں) پر سفاکانہ اعمال یا جسمانی زبرد کو ب کے ذریعہ حاصل کیا جائے۔ اس کے علاوہ دوسروں کو ذلیل کرنے، چوٹ پہنچانے، مجروح کرنے حتیٰ کہ نیست و نابود کرنے کے ذریعہ جنسی لطف حاصل کرنے کو بھی سادیت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ٹیڑھی لکیر کی ہیروئن اس مرض میں شروع سے ہی مبتلا رہی ہے۔ اور اس ناول میں کئی جگہ سادیت پسندی کی مثالیں ملتی ہیں۔ شمن اکثر جنونی حالت میں چیزوں کو نوچتا ہے مارتی ہے جب انسانوں پر بس نہیں چلتا ہے تو وہ چیزوں کو خاص کر اپنی گڑیا پر غصہ کا اظہار کرتی ہے۔ لوگوں کو مارتا۔ پیٹتا۔ دانت کا ٹنا وغیرہ تو اس کا پسندیدہ کام تھا۔ شمن کی آپا جب اس پر حکم چلانے لگی بار بار لوگوں کے سامنے اسے زوری کے مقابلے میں نیچا دیکھانے لگی تو وہ نہایت غصہ اور جنون کی حالت میں ان سے بدلہ لینے کی خواہش مند نظر آتی ہے اور جب اس کا بس آپا پر نہ چلا تو وہ ان کی کیاری پر ٹوٹ پڑتی ہے۔

شمن کی بڑی بہن منجھو بی جس نے شمن کی پرورش کی تھی وہ شمن کو ہمیشہ صاف ستھرا دیکھنا چاہتی تھی، شمن کو نہلا کر صاف اور اچھی فراک پہنا کر اسے صاف رہنے کی ہدایت دیتی شمن کو خوب معلوم تھا کہ کیڑا کنڈا کرنے پر منجھو کو تکلیف ہوتی ہے۔ اور جب منجھو بی سسرال سے واپس آئی تو شمن منجھو کو تکلیف پہنچانے کا ایک نیا طریقہ تلاش کر لیتی ہے۔

”بس بس، اب ٹھیک ہوئیں اس نے نچیل میں کسی پر دانت پیسے اور

پھر وہ وہیں زمین پر لوٹ گئی۔ منجھو نے آج اُسے نہلایا تھا، بال سنوارے

تھے، تو بس اب اس کی یہی سزا ہے! اس نے بھر بھر مٹھیاں ریت کی اپنے

بالوں میں ڈالیں، خوب کیاری کی کیچڑ میں تلابازیاں لگائیں۔ زمین پر تھوک

کر تھیلیوں سے رگڑا اور پھر وہی تھیلیاں اپنے منہ اور گردن پر پھر لیں“ لے

صرف اتنا ہی نہیں شمن نے جیسے جیسے زندگی میں قدم آگے بڑھایا تھا دوسروں کو تکلیف

پہنچانے اور ٹیس کرنے میں اسے مزا آنے لگا تھا، ٹیلر سے شادی ہو جانے کے بعد شمن
 نے یہ باتیں انجانے میں ہی سیکھ لی تھیں مگر جب اسے یہ احساس ہوا کہ اس کی
 ان باتوں سے ٹیلر خوش ہوتا ہے تو اس نے فوراً موقع دیکھ کر اچھی عادتوں کو چھوڑنے
 کی قسم کھالی۔ تاکہ ٹیلر کو زیادہ جلا سکے تکلیف پہنچا سکے۔

”وہ جان بوجھ کر اصول توڑتی معمولی بیماری کے بہانے سے
 کھانا بستر کے پاس منگوا لیتی بجائے نائٹ سوٹ کے اس نے غرارہ
 اور کرتا پہننا شروع کیا۔“

شمن کو معلوم تھا کہ ٹیلر کی والدہ کو بچوں کا بہت شوق ہے اور عام طور سے ہر ساس
 اپنی بہو سے بچہ کی خواہش رکھتی ہے۔ مگر شمن نے یہاں نہ صرف اس بوڑھی ساس کا
 دل دکھایا بلکہ ان کے جذبات کا مذاق بھی اڑایا۔

”مُمی ————— ان کی خواہش ہے —————“ کچھ کہتے کہتے رک
 گیا شدت احساس سے کان سرخ ہو گئے ”مُمی بچہ تو نہیں جو سمجھ نہ
 جائیں وہ خود خلاف ہوں گی“

”کون مُمی ————— ارے توبہ کرو۔۔۔۔۔ دیوانی ہیں وہ بچوں کی
 ————— تمام ادھر ادھر کے بچوں کو چمٹائے رکھتی ہیں۔“

”تو اب بھی ادھر ادھر کے بچے موجود ہیں شوق سے چمٹائیں۔“

شمن شادی کرنے کے بعد بھی اپنی عادت سے نجات نہ پاسکی تھی۔ اس میں اور ٹیلر میں
 بہت لڑائیاں ہوتیں، وہ ایسی ایسی بات کہتی جس سے ٹیلر کو خوب تکلیف ہو اور رنج
 ہو یہ اس کی عادت تھی اور وہ عادت کی غلام۔

”تم ————— تم بیسوا سے بھی بدتر کسی خلیث طبقے سے ہو۔۔۔۔۔
 ————— کاش ایک بار کوئی تمہارا گلا گھونٹ کر مجھے آزاد کر دے۔۔۔۔۔“

نفسیاتی بیماریوں کے ساتھ ایسی دکھائی دیتی ہے جیسے چونٹیوں بھرا کباب۔
 اس طور ٹیرہی لکیر میں انسانی نفسیات بالخصوص نفسیاتی الجھنوں اور
 بیماریوں کی مثالیں جا بجا نظر آتیں ہیں۔ اس لئے ٹیرہی لکیر کو اردو میں نفسیاتی الجھنوں
کا مرقع یا اپنی نوعیت کا سب سے منفرد نفسیاتی ناول کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

طہی لکیر کا اسلوب و زبان

کسی بھی ناول کے معیار کو جانچنے اور اس کی قدر قیمت کا اندازہ لگانے کے لئے اس ناول کے قصے، پلاٹ، کردار، فضا، ماحول اور اس میں پیش کئے گئے نظریہ حیات کے علاوہ ناقدین فن اس کے اسلوب اور زبان کے محاسن و معائب کا بھی جائزہ لیتے ہیں کیوں کہ فن ناول نگاری میں اسلوب و زبان کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس ضمن میں اظہر پر وزیر اپنی کتاب ادب کا مطالعہ میں لکھتے ہیں۔

”جس طرح بت تراش مجسمہ بنانے کے بعد

اس کے جذبات کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کی نوک پلک درست کرتا ہے اسی طرح ایک بڑا ناول نگار اپنے ناول کے مواد کو مرتب کرنے کے بعد اس کے فنی پہلوؤں کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہ ناول کو ہر زاویے سے دیکھتا ہے اور اس میں تناسب پیدا کرتا ہے یہ دیکھتا ہے کہ زبان صحیح ہے اور پورے طور پر موضوع کے ساتھ ہم آہنگ ہے یا نہیں۔ ناول نگاری تخلیقی فن ہے۔ اس کے لئے بھی اسی فنی اہتمام کی ضرورت ہے جس کی شاعری میں توقع کی جاتی ہے۔ یہاں بھی الفاظ کی جادوگری اپنا کام کرتی ہے۔ یہاں تک کہ محاورات بھی اسی اہتمام سے استعمال ہوتے ہیں۔ بات کتنی ہی اچھی ہو لیکن اگر ڈھنگ سے کہی جائیگی تو اس کے پڑھنے والے یا سننے والے پر کوئی اثر نہ ہو گا۔“

گویا کسی بات کو صرف کہہ دینا ہی ناول کے لئے کافی نہیں بلکہ اس انداز میں کہنا لازمی ہوتا ہے جس سے بات میں اثر پیدا ہو۔ عصمت چغتائی ایک تو بات اشاروں کناروں میں زیادہ کہتی ہیں دوسرے کسی بات کو براہ راست نہیں بلکہ مخصوص طنز یہ انداز میں کہتی ہیں۔ ان کے اشارے نہایت بلیغ ہوتے ہیں مگر انہیں سمجھنے میں قاری کو کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ یعنی ان کے اشارے کسی بھی سطح پر ترسیل کی ناکامی کا المیہ نہیں بنتے۔ اس طرح ان کے طنز میں خاص کاٹ ہوتی ہے۔ طنز کا کوئی وار خالی نہیں جاتا۔ لیکن وہ طنز کو کہیں بھی ”زیر قند“ نہیں بننے دیتی ہیں۔ اس لئے طنز کا اثر کاری ہوتا ہے۔ معروف و ممتاز ترقی پسند نقاد مجنوں گورکھپوری عصمت کے فن پر تبصرو کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”لوگ کہتے ہیں کہ عصمت نے بے باکی اور عریانی میں مردوں کے بھی کان کاٹے ہیں۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس انداز کی جنسیاتی بے باکی جس کو عریانی کہنا تو خیر غلط سیانی ہے اس لئے کہ عصمت کا فن اشاریت ہے مردوں کے محکمہ کی چیز ہی نہیں ہے۔ غور کیجئے تو ماننا پڑے گا کہ ایسی جرأت ایک طنز غور ہی کر سکتی ہے جو باغی ہوگی۔ اور عصمت ترقی پسند ہوں یا نہ ہوں ان کو باغی تسلیم ہی کرنا پڑے گا۔ اگرچہ ان کی بغاوت ایک نقطہ پر مرکوز ہو کر رہ گئی ہے۔“

مجنوں گورکھپوری کے نزدیک عصمت چغتائی ایک باغی فن کارہ ہیں۔ بغاوت ان کا پہلا وصف ہے اور ترقی پسندی ثانوی چیز ہے۔ مجنوں ایسے بالغ نظر نقاد بے باکی اور عریانی کو صرف مردوں کے دائرہ اظہار کی چیزیں مانتے ہیں۔ اس معاملے میں عورتوں اور مردوں کی تخصیص کے قائل نہیں۔ دراصل ادب میں عریانیت اور فحاشی کا سلسلہ اتنا دشوار گزار مرحلہ ہے جسے حل کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات بھی نہیں۔ بسا اوقات عام لوگوں کی نظر میں جو چیز فحاشی یا عریانیت کا نام پاتی ہے عین ممکن ہے وہی چیز ایک حلال ادبی نقاد کے نزدیک فن کی معراج قرار پائے۔ اردو ادب کا مخصوص شاعری میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً شاہ سراج کی مثنوی ”خواب و خیال“ ہی کو لے لیجئے۔ اس میں بیان کردہ واقعات عشق کیفیات

قلمی کو بعض ثقہ قارئین نے "بو الہوس" اور "حیا سوزی" سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن بعض کے نزدیک یہی شمنوی صوفیانہ اسرار و رموز کی حامل اور فن کا بہترین نمونہ قرار پاتی ہے۔ اس طرح عصمت کی بنیاد پر بے باکی کو مجنوں گو کہ کھپوری جیسے بزرگ اور معتبر نقاد "عریانیت" ماننے کے لئے تیار نہیں کیوں کہ وہ فن اور عریانیت کے حدود سے کما حقہ واقفیت رکھتے ہیں۔ اسی لئے وہ نہایت ذمے داری کے ساتھ محتاط انداز اختیار کرتے ہوئے عصمت کے فن کو اشاریت کا فن قرار دیتے ہیں جو کہ ایک دیانت دارانہ اور مستحسن اقدام ہے۔

عصمت بات کو اس انداز سے پیش کرتی ہیں کہ پورا منظر نظر میں گھوم جائے۔ بڑی بکری میں شمن کی پیدائش کا منظر ملاحظہ ہو۔

"وہ پیدا ہی بہت بے موقع ہوئی۔ بڑی آپاکی چہتی سہلی سلمیٰ کی شادی تھی اور وہ بیٹھی جھپا جھپ سردی کرپ کے دوپٹے پر چمکا مانگ رہی تھی۔ اماں اتنے بچے جننے کے بعد بھی ننھی ہی بنی ہوئی تھیں۔ بیٹھی جھاڑے سے اڑیوں کی مردہ کھال گھس گھس کرتا رہی تھیں کہ ایک ایک گھٹا جھوم کر گھر آئی اور وہ دہائی ڈالی کہ میم کو بلانے کا سارا ارمان دل کا دل ہی ملے اور وہ آن دمکی۔ دنیا میں آتے ہی گلے میں گھانٹی کئے ایسا دہاڑی کہ توبہ بھلی"۔

اس اقتباس کی خوب صورتی ایک تو عصمت کے انداز بیان میں چھپی ہوئی ہے جو کہ چند الفاظ کے سہارے ایک غیر معمولی واقعے کو اس کے پورے کوائف کے ساتھ، اختصار کے ساتھ بیان کرنا عصمت کی ہی خوبی ہے۔ جیسے 'وہ پیدا ہی بہت بے موقع ہوئی' یہ پڑھ کر ہنسی آتی ہے گویا اب بچوں کو بھی موقع محل دیکھ کر دنیا میں قدم رکھنا چاہئے۔ اور دیکھئے ایک ایک گھٹا جھوم کر گھر آئی اور بغیر گلے میں گھانٹی کئے ایسا دہاڑی کہ توبہ بھلی۔ ان باتوں کو بہت آسان جملوں میں کہا جاسکتا تھا مگر عصمت کا انداز بیان کچھ اور ہی ہے۔ ان کی زبان میں متوسط طبقے کی عورت اپنے طبقے کا قصہ بیان

کر رہی ہے۔ وہی الفاظ، وہی اشارے وہی کلمات، گویا عصمت الفاظ کو نئے معنی اور مفہوم میں استعمال کرنے کا گر جانتی ہیں۔ کرشن چندر اپنے ایک مضمون ”میرے ہدم میرے دوست“ میں لکھتے ہیں

”عصمت سے بات کرنا نہایت آسان ہے

اور ختم کرنا نہایت مشکل۔ یہی بات ان کی ناول میں ہے

ایک بار شروع کر دیجئے تو کہاں پر کس مقام پر ہم روکیں یہی سوال بار بار دل میں اٹھتا ہے اور اس طرح کئی صفحات اور آگے ہم بڑھ جاتے ہیں۔ عصمت بہت سی چھوٹی موٹی اور غیر اہم باتوں کو بھی اس طرح پیش کرتی ہیں گویا کہہ رہی ہوں ”ارے ارے بھی آپ کی توجہ کی ضرورت لاحق ہے۔ ذرا رکتے، پڑھئے، غور کیجئے اور سمجھئے“ ص ۱۷

عصمت چغتائی شمالی ہند کے مسلمانوں کے متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہیں اس

لئے ان کے افسانوں اور ناولوں میں بھی اس طبقے کی بہترین اور حقیقی عکاسی ملتی ہے۔ کیوں کہ یہ طبقہ اس کی خواتین اور اس کے مرد، اس کے بچے اس کے بوڑھے اور بوڑھیاں سب کے عادات و اطوار اور خوبیوں اور خامیوں سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ ان گھروں کی روزمرہ زندگی کی سچی تصویریں دیکھنی ہوں تو عصمت چغتائی کی تحریروں ہی میں نظر آئیں گی۔ کیوں کہ عصمت اس طبقے کی ”محرم راز“ بھی ہیں اور سچی نبض شناس بھی۔ لیکن وہ اس راز میں ایک خاص سلیقے کے ساتھ اپنے قارئین کو بھی شامل کر لیتی ہیں اور کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ اس طبقے کی زندگی سے یکلاخت سارے پردے گرا دیتی ہیں اور قارئین کی نظروں میں وہ ساری چیزیں سما جاتی ہیں جن سے اب تک وہ نا آشنائے محض تھیں۔ ایسے مواقع پر عصمت کا رویہ تحسین شاد کی بجائے تحسین محسوس ہوتا ہے جو صرف اور صرف تحسین کے خاطر کچھ بھی کر گزرتا ہے۔ لیکن اس کے بالکل برعکس کبھی کبھی وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ زندگی کے حقائق کی ایسی تصویر کشی بھی کرتی ہیں جو صرف انہیں کا حصہ معلوم

۱۷ کرشن چندر۔ میرے ہدم میرے دوست

ہوتا ہے۔ بزرگ ناقد کشن پرشاد کوں "عصمت چغتائی کے فن پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" یہ چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتیں جو ہم نے اور آپ نے اپنے اپنے گھروں میں سنی اور دیکھی ہیں۔ ہم میں سے اکثر پر خود کبھی بیٹی ہوں گی۔ ان میں سے جو باتیں مکروہ ہیں ان کو تو اس وقت دماغ سے نکال کر پھینک دیا جاتا ہے۔ ورنہ دماغ کیسے صحیح رہے جو کسی قدر شہوانی ہیں اور بعض بچپن کی باتیں سہانی معلوم ہوتی ہیں وہ کچھ دن یا درہ جاتی ہیں اور پھر ہم انہیں بھول جاتے ہیں۔ عصمت چغتائی نے بھی یہ باتیں سنی اور دیکھی ہیں شاید ان پر بھی بیٹی ہوں۔ ان کو یاد رہ گئیں انہوں نے ان پر غور کیا ہے۔ ان کے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور جو کچھ سمجھ میں آیا ہے اس کو بلا تکلف کہہ دینے کی ہمت کی ہے۔ ہمارے گھروں کی کیا کیفیت ہوتی ہے ہم اپنے بچوں کی پرورش اور تربیت کس طرح کرتے ہیں اس ناول کے تقریباً سو صفحات میں انہوں نے اس کا ہر پہلو نقشہ اس طرح اتارا ہے کہ پوری تصویر ہماری نگاہوں تلے پھر جاتی ہے۔"

عصمت نے سخن کے کردار کا ارتقار اس ناول میں اس فن کاری اور باریکی سے دکھایا ہے کہ کہیں بھی غیر فطری محسوس نہیں ہوتا۔ گویا اس معاملے میں انہیں تخیل سے بھی کام لینا پڑا ہے اسی وجہ سے اکثر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شتمن عمر سے بڑی اور زیادہ عقلمند ہے۔ مٹی کھانا، دھول مٹی گندگی میں کھیلنا شاید ہی کسی بچہ کی فطرت میں شامل نہ ہو۔ مگر عصمت اس کے بیان میں بھی جان ڈال دیتی ہیں۔ صرف بچوں کے عادات و اطوار ہی نہیں بلکہ بڑوں کے رویوں کی تصویریں بھی جس خوبی سے کھینچی ہیں وہ عصمت ہی کا کمال ہے۔ گھر بلو زبان کی تو آپ ملکہ ہیں جسے نیا جو لا پہنا کر آپ نے سب کے سامنے پیش

کر دیا ہے۔ مٹی کھانے اور اس پر بڑوں کا غصہ ہونا اور پھر بچوں کے نہلانے کا ذکر
 ملاحظہ ہو جس میں بچوں کی معصوم فطرت کی خوب صورت چمکیاں عصمت کے فن کا لا
 جواب نمونہ بن کر ابھری ہیں۔

”وہ زور سے بھینس کے پڈھے کی طرح
 ڈکرائی — پلکوں کی ریت آنسو سے دھیل جاتی اور کھلم
 کی وجہ سے دونوں نمٹنے سٹ سے کھل جاتے جیسے اٹی ہوئی نالی
 میں تیزاب ڈال دیا ہو۔ پھر گھونسوں اور گرمدار دھوکوں کے
 شادیانوں کے ساتھ غشت شروع ہوتا۔ پھر صاف ستھرا خمر اک
 پہن کر وہ اپنی غلطی کو بڑی تیزی سے محسوس کرتی اور پچھلے گناہوں
 سے تائب ہو کر آئندہ نیک چلنی کا ارادہ باندھتی وہ پختہ فیصلہ
 کر لیتی کہ اب کچھ اور مٹی سے تو کوئی واسطہ نہ رکھے گی۔ دھول میں
 لوٹنا تو قطعی بند۔ اس وقت اس کے چہرے پر تارک الدنیا
 سا دھوکا سا استقلال چھا جاتا۔ جو اپنے جسم کے کسی عضو کو معطل
 کر لینے کا قصد کر چکا ہو۔ چیل جیسی چوکنی آنکھیں، کبوتر کی طرح
 معصوم ہو کر اونگھنے لگتی“ ۱۷

عصمت اپنے ارد گرد کی زندگی اور اس پاس کے ماحول کو بالکل اس طرح بیان کرتی ہیں
 جیسا کہ وہ ہے اس میں گندگی بھی ہے غلاظت بھی۔ گائے، بیل، مرغیاں، کتے اور
 ان سب کے درمیان ننھے منے، سنجیدہ اور شریر ہر طرح کے بچے بھی ہیں۔ ان کی
 غربت بھی ہے اور ان سب کے ساتھ ساتھ دبی سہمی بڑکیاں بھی ہیں۔ بقول مظہر اُم
 ”عصمت کی دنیا غربت، جہالت اور

غلاظت کی دنیا ہے۔ مشترکہ خاندان میں کیرے مکوڑوں کی
 طرح پلنے والے بچے پیشاب پینانے کی سڑاند اور باند، میل

اور پیسنے میں اٹی ہوئی خادماں ہیں۔ دبی دبی گھٹی گھٹی پردے کے
پیچھے سے جھانکنے والی تاکتھالڑکی جو پردے ہی پردے میں نامائز
بچے بھی پیدا کر لیتی ہے۔ عصمت پردے کے پیچھے کلنلالتے ہوئے
اداسات و جذبات کی معصومی تیز چکاچوند پیدا کرنے والے
رنگوں سے کرتی ہیں، ”

منظر امامیہ بات ان کے افسانوں کے لئے لکھتے ہیں مگر عصمت کے ناول ٹیڑھی لکیر پر
بھی یہ بات صادق آتی ہے۔ اس میں بھی عام گھروں کے حالات بے کم و کاست الفاظ
میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔ عصمت کے صرف دو چار جملوں سے گھر کے حالات لوگوں کے
خیالات اور سماج کی رسم و رواج کی طرف بھی اشارہ ہو جاتا ہے۔ اس بیان سے ایسا نقشہ
کھینچتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم صرف کچھ نہیں رہے بلکہ اپنے یا کسی ساتھی کے بچپن کا حال
کسی بزرگ سے سن رہے ہیں۔ عصمت کہیں لمبی چوڑی باتیں کرنے لگتی ہیں تو کہیں چند
ایسے جملے اچھا ل دیتی ہیں جس سے گھر کا پورا معاشی، تعلیمی اور سماجی پس منظر واضح ہو جاتا
ہے۔ چند فقرے اور جملے ملاحظہ ہوں۔

{ ”دو بھینسوں کے دودھ تبرک ہو جاتا پھر بھی ان کے
تندور ٹھنڈے ہی پڑے رہتے،“ ص ۲
چونکہ گھر میں لوگ زیادہ ہیں اس وجہ سے دو بھینسوں کا دودھ بھی کم پڑتا ہے۔ اس طرح شمن
کو تنہا بتاتی ہیں کہ ابھی تو یہ کتاب یعنی پڑھائی کی ابتدا ہے بعد میں بھائی جیسی کتابیں
پڑھنی پڑیں گی۔ صرف اس جملے کے علاوہ پوری ناول میں کہیں گھر والوں کی طرف سے پڑھائی
کا ذکر نہیں ملتا۔
”پھر پڑے بھائی جیسی موٹی موٹی کتابیں پڑھا کرنا۔“ ص ۲۲

منظر امام شماره ۱۹۸۵ء ص ۲۹

عصمت چغتائی ص ۱۱

عصمت چغتائی ص ۲۲

۱ الفاظ

۲ ٹیڑھی لکیر

۳ ٹیڑھی لکیر

”مر جائے اللہ کرے مجھ کو بی مر جائے“ اماں اپنی لاڈلی
کو کوستے دیکھ کر خوب بگڑاں،،، لہ

”اس سے بہتر تو وہ اخبار ہوتا تھا جس سے ابالفاظ
سابنا کر پیار میں اس کے سر پر مارا کرتے تھے“ لہ
”مانا روپیہ بھی ہے اور لڑکی کو دکھانے کا فیشن
نہیں“ لہ

”محبت گو غریب سے ہوتی ہے مگر شادی تو امیر
ہی سے کرنی چاہئے نا بھی“ لہ

عصمت چغتائی کی زبان میں کسی چشمے کی سی روانی ملتی ہے۔ جب وہ کسی بات یا کسی کیفیت
کے اظہار پر آتی ہیں تو نہایت بے تکلفانہ انداز میں بے محابا لکھتی چلی جاتی ہیں۔ زبان ان کے
لئے لوجہ دار گیلی میٹی کی حیثیت رکھتی ہے جسے وہ حسب منشا موڑتی توڑتی جاتی ہیں اور اسے
جس شکل اور جس انداز میں ڈھال لیتی ہیں۔ ان کا تخلیقی ذہن اس عمل میں ان کے مافی الضمیر
کے ساتھ مکمل ہم آہنگی کا ثبوت دیتا ہے۔ عصمت کی زبان کی سب سے پہلی پہچان
اس کی بے سافہ اور نادر تشبیہات ہیں۔ ان تشبیہات کے ذریعہ وہ نہ صرف یہ کہ اپنے
دل کی بات بڑی آسانی اور سادگی کے ساتھ کہہ جاتی ہیں بلکہ اس کے ذریعہ وہ شدت تاثر
میں بھی خوش گوار اضافہ کرتی ہیں۔ دراصل ان کی انشراح کی دل کشی اور رنگینی میں ان کی دل کشی
اور نادر تشبیہات کا بڑا حصہ رہا ہے۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

”اس نے پلایا پلایا کے ایک کونے میں اس کی نرم گرم

انا پکے آم کی طرح گول مٹول سی ہو رہی تھی۔“ لہ

ط	ٹیرھی بکیر	عصمت چغتائی	ص	۲۵
۲	ٹیرھی بکیر	عصمت چغتائی	ص	۲۱
۳	ٹیرھی بکیر	عصمت چغتائی	ص	۱۲
۴	ٹیرھی بکیر	عصمت چغتائی	ص	۲۱۶
۵	ٹیرھی بکیر	عصمت چغتائی	ص	۱۲

”مجھے اماں جیسے چو پچلے تو آتے نہیں۔ وہ کہتی حالانکہ
دو لڑکیوں کو ننھی آم کی طرح ہر وقت چوا چاٹا کرتی تھیں۔“

”مگر زمانہ سازگار نہ تھا۔ دوسرے دن جب عین
اسی وقت اسی عبرت ناک حالت میں ایک بدمست شرابی کی طرح
جھومتی دھول کی افشاں میں جگمگاتی نظر آتی۔“

”..... وہ ان بے پناہ شیطانی رعنائیوں سے بچنے کے لئے
بہت مضحک ہو جاتی مگر پھر وہ پکار پکار کر بلاتیں تو وہ کٹی ہوئی پتنگ
کی طرح اس ابدی گناہ کے غار میں جا گرتی ہے۔“

”کت کت مشین کے دانتوں کے نشان دیکھ کر اس کے
اپنے سوڑھوں میں سویاں سی چبھنے لگیں یوں ہی جو سرے پر ٹپکتا
ہوا ڈھلکا پڑ کر کہنی پا تو کچے زخم کی طرح ٹانگے ٹوٹتے چلے آئے۔ بڑا مزہ آیا
جیسے وہ جلدی جلدی چھوٹی چھوٹی سیڑھیوں اتر رہی ہو، قاعدے
کے ورق بکھر گئے۔“

”نجمہ سے کم یا زیادہ! نجمہ اور چیز تھی۔ دیکھتی ہوئی شراب
اور بلیقہ صاف شکر ہوا میٹھا پانی۔“

”وہ کمرے پلنگ پر پانی چھڑک کر پڑ رہی جسم
میں گرم گرم سلاخیں دوڑتی معلوم ہوتی تھیں۔ حلق بار بار کاغذ کے
ٹکڑے کی طرح خشک اور بے لذت ہو جاتا۔ اتو کی بخار سے جھلسی ہوئی
آواز اس کے کان میں سانپ کی پھنکار کی طرح رینگ رہی تھی۔“

۵۰	ص	عصمت چغتائی	۱	ٹیر می بکیر
۱۶	ص	عصمت چغتائی	۲	ٹیر می بکیر
۱۶	ص	عصمت چغتائی	۳	ٹیر می بکیر
۲۳	ص	عصمت چغتائی	۴	ٹیر می بکیر
۱۱۶	ص	عصمت چغتائی	۵	ٹیر می بکیر
۱۳۹	ص	عصمت چغتائی	۶	ٹیر می بکیر

” رسول فاطمہ کی سوکھی ہوئی انگلیاں کمبلوں کی طرح
چبھ رہی تھیں۔ “ ۱۷

” شاؤں پر پھولا جھول اس کی مکر کو اور بھی پست بنا دیتا
اور اس کا کاسی چننا ہوا دوپٹہ جو شاؤں پر سے ہوتا ہوا بغل میں
گھوم جاتا تھا اور انچسل تازہ پھولوں کے گچھے کی طرح سمٹ کر بازو
پر جھولا کرتا۔ “ ۱۸

” جیسے کسی نے اس کی خاموش دے ساؤں کی آہٹ سن لی۔ اس کا
دل غبارے کی طرح پھولنا شروع ہوا۔ “ ۱۹

تشبیہ اور استعارے شاعر یا ادیب کے تخلیق کی بلند پروازی کی طرف اشارے
کرتے ہیں۔ نادر تشبیہ اور نایاب استعارے اگر نثر میں دیکھنا ہوں تو عصمت کے
یہاں تلاش کیجئے۔

عصمت کا تخلیقی ذہن جب کسی تجربے یا واردات یا کیفیات کے اظہار پر آتا
ہے تو بلا اوقات خوب وارشت میں بھی فرق نہیں کرتا۔ موقع اور محل کے اعتبار سے حسین
اور دلکش تشبیہات کے ساتھ ساتھ ایسی تشبیہات بھی پیش کرتا چلا جاتا ہے جو مستعین مزاج
رکھنے والوں کے دماغوں کو یقیناً گراں گزرتی ہوں گی۔ لیکن عصمت ان کی پروا نہیں کرتی ہیں
ٹیڑھی لکیر میں پیش کردہ دشمن کی زندگی بالخصوص اس کے بچپن سے متعلق مسائل اس عصمت
چغتائی نے بڑی حد تک کریمہ، غلیظ اور ناگوار تشبیہات کا استعمال کیا ہے۔ اس حصے میں انہوں
نے کسی جگہ نہایت غلیظ اور مذکورہ تشبیہات سے بھی کام لیا ہے۔ جیسے پلے کی طرح
” بھینس کے کیرٹے کی طرح “ ” غرائی بی کی طرح “ ” مکڑی کی طرح “ ” سڑی ہوئی نالی کی طرح “
” شیر کی طرح “ ” زخمی مینڈھکوں کی طرح “ اور بھی اسی طرح کے جانور جو ہم آپ دیکھتے

۱	ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	ص	۸۴
۲	ٹیڑھی لکیر	”	ص	۹۲
۳	ٹیڑھی لکیر	”	ص	۹۶

میں مگر ان کو اہمیت نہیں دیتے عصمت نے عزت بخشی ہے۔ عام طور سے لوگ اچھی اور خوشگوار چیزوں سے تشبیہ دیتے ہیں مگر عصمت نے جس کثرت سے مکروہ اور غلیظ چیزوں کا استعمال کیا ہے اور خاص کر روزمرہ انسانی حرکات کا جانوروں کی حرکات سے تشبیہ دینا ان کی فنکاری کا اچھا نمونہ مانا جاسکتا ہے۔ عصمت کی کچھ ایسی تشبیہیں دیکھئے جو انہوں نے جانوروں اور کپڑوں سے دی ہیں۔ ٹیڑھی بکیر میں شمن کی انا کو اس کی عیاشی کی وجہ سے نکال دیا جاتا اس کے بعد شمن کی بڑی بہن منجھو لے پالنے لگتی ہے۔ شمن کو چونکہ آنکھ سے بہت لگاؤ تھا اور وہ بچہ تھی اس لئے منہ سے کہہ نہیں سکتی ہے مگر محسوس کرتی ہے اور بار بار انا کی تلاش اپنے معصوم جذبات سے کرتی ہے۔ عصمت نے اس بات کو کچھ اس انداز میں پیش کیا ہے

”یکایک ساری انا میں کہیں غائب ہو گئیں۔ اس کا
جی کھلا گیا۔ ندیدی کتیا کی طرح سونگھ سونگھ کر وہ انا کو دھونڈنے
لگی۔“ ۱۷

”پھر بھی ایک دم سے وہ بوتل کو چھوڑ کر جلدی سے
منجھو سے چٹ جاتی اور پلے کی طرح اس کے کپڑوں میں اپنی انا کو
ڈھونڈنے لگتی۔“ ۱۸

جانوروں سے تشبیہ کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

”سب سے پہلا کام منجھو بی یہ کرتی تھی گھونسوں، تپڑوں
اور جانتوں سے جتنی دھول جھڑکتی جھاڑوتیں وہ روز بھینس کے
پڈے کی طرح ٹوکراتی۔“ ۱۹

”جیل جیسی چونکا آنکھیں کبوتر کی طرح معصوم ہو کر
ادھکھنے لگتی۔“ ۲۰

۱۲	ص	عصمت چغتائی	۱	ٹیڑھی بکیر
۱۲	ص	عصمت چغتائی	۲	ٹیڑھی بکیر
۱۴	ص	عصمت چغتائی	۳	ٹیڑھی بکیر
۱۴	ص	عصمت چغتائی	۴	ٹیڑھی بکیر

”جب سب اسے چھیڑنے کے لئے بھتی بھتی کہتے تو واقعی چڑیلوں کی طرح آنکھیں نکال کر غراتی۔ بلی کی طرح وہ دشمن پر جھپٹا مارتی۔“ ۱۷

”بھنچو تو دکن بنی بیٹھی تھی اس لئے وہ بے منتے سیل کی طرح گھومتی رہی۔“ ۱۸

”پڑھی پڑی وہ منجھو کے کینے دوہا کو کوسا کرتی جو اسے چیل کی طرح جھپٹا مار کر چپین لے گیا۔“ ۱۹

”مگر یہ ہیرا سی بیٹی اسٹھتی جوانی میں رائڈ ہو گئی دو بچے مرحوم نے اپنی نشانی چھوڑے جنہیں وہ چیل کی طرح نگہبانی کر کے پال رہی تھی۔“ ۲۰

”جب ٹیچر کمرے میں آئیں تو سب کھڑی ہو گئیں۔ مگر وہ الود کی طرح بیٹھی رہی۔“ ۲۱

”اس کی بڑی بڑی آنکھیں زخمی مینڈھکوں کی طرح پھول کر ابھر آئیں۔“ ۲۲

عصمت نے جگہ جگہ نہ صرف شیشیتا، کبوتر، چیل، سانپ، مینڈک اور بکریاں تشبیہ دی ہے بلکہ پھول، اڈے، تازہ گلاب، نئی شراب جیسے الفاظ کو نئے معنی میں خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

عصمت چغتائی کا اسلوب اردو ادب میں حسین و دل کش اور تازہ کار اسلوب کی ایک بہترین مثال ہے۔ اس اسلوب کی خصوصیات کچھ ایسی ہیں کہ بظاہر سادہ اور آسان ہونے کے باوجود اس کی تقلید یا نقالی از حد دشوار ہے بلکہ بڑی حد تک ناممکن عمل محسوس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو نثر میں عصمت کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ بقول مظہر امام

۱۔ ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی ص ۱۷	۲۲۔ ٹیڑھی لکیر	ص ۱۷
۲۔ ”	” ص ۲۶	”	” ص ۲۶
۳۔ ”	” ص ۲۰	”	” ص ۲۰

”ان کے (عصمت) اقتضائوں کے تار و پود میں تو انہی
ان کے اس اسلوب سے آئی ہے جو اردو میں منفرد ہے اور جس کی نقل
کسی کے بس کا روگ نہیں۔ کرشن چندر، بیدی، منٹو
ہر ایک کے اسلوب کی نقل کی گئی ہے لیکن عصمت کے انداز بیان
اور زبان کی تقلید ممکن ہی نہیں،“

مگر اس کے باوجود ایک بات قابل غور ہے ناول میں عصمت جس طبقہ کا ذکر کر رہی ہیں وہ طبقہ
پھولوں باغوں اور نیچر سے کوسوں دور رہتا ہے۔ متوسط طبقہ روزی روٹی کمانے اور بچہ پیدا
کرنے میں لگا رہتا ہے اور گھریلو ماحول میں انسان کا سابقہ جانور کیڑوں، مکوڑوں نالی اور
شراب سے ہی پڑتا ہے۔ ان کی تشبیہات بھی اپنے طبقے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اپنی زبان کے
بارے میں خود عصمت کا دعویٰ ہے کہ وہ بناوٹی نہیں ہے جوں کا توں بات کہہ دینا عصمت کی
وہ خوبی ہے جس کی نقل نہ کوئی کر سکا ہے نہ کر سکتا۔ ویسے کسی کی نقل مکمل طور سے کی بھی نہیں
جاسکتی ہے۔ عصمت کا قول خود اپنی زبان کے بارے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

۴

”اگر کہیں الفاظ میں بے بودگی آجاتی ہے

تو اس کی ذمہ داری نہیں ہوں۔ میں سمجھتے وقت یہ نہیں سوچتی کہ یہ جملہ
فلاں شخص کے منہ سے نکلا ہے۔ وہ عام انسان کے سننے کے لائق
ہے کہ نہیں میں اس کو ویسے کا ویسا اپنے قلم سے لکھ دیتی ہوں کیونکہ
میں مصور نہیں ہوں فوٹو گرافر ہوں۔“

عصمت جیسا محسوس کرتی ہیں ویسا ہی بیان کرتی ہیں۔ اگر کسی خوب صورت لڑکی کا پیکر
دیکھ کر انہیں مور کے انڈے یاد آتے ہیں تو وہ ویسا ہی لکھ دیتی ہیں۔
”اس کے پیر دیکھ کر دشمن کا دم نکل گیا۔ مور کے

انڈے جیسی ایڑیوں میں لال روشنائی۔“

۱۔ ماہنامہ الفاظ شمارہ ستمبر ۱۹۸۰ء ص ۲۹	منظر امام
۲۔ ماہنامہ شاعر شمارہ ۱۹۷۶ء ص ۱۲	یونس اکاسر
۳۔ ٹیڑھی نیکر عصمت چغتائی ص ۹۶	

عصمت کے بیان میں جو لذت ہے اسے قاری اپنے ذہن میں محسوس کر لیتا ہے۔ ٹیڑھی لکیر میں لذت کا بہاؤ اس روانی کے ساتھ ہے کہ قاری بہتا چلا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو

”اب تو اسے نجمہ کی طرف آنکھ اٹھاتے بھی شرم آتی تھی مگر قوتِ احساس اسے سب کچھ بتا دیتی تھی... کہ اب نجمہ کدھر دیکھ رہی ہے... اس کے بکھرے ہوئے بال کدھر کدھر زیادہ جھک گئے ہیں... آج اس نے مندل سنگھائی کے ریشم کا کرتا پہنا تو وہ ایسا جسم پر چمک گیا ہے جیسے جسم پر مندل لی وارنش چڑھا دی گئی ہو... آج اس کے چمکیلے دانت دنداسہ لگانے سے ویسے معلوم ہو رہے تھے جیسے شراب کے گلاس میں موتی تیر رہے ہوں۔ سفید سفید چمکیلے دھار والے نیولے کے نوکیلے دانت شمن آہستہ آہستہ اپنے دانتوں پر زبان پھیرتی تو بڑی گدگدی معلوم ہوتی تھی۔“

ان کا ہر بیان تشبیہ اور استعارہ کے بغیر ادھورا ہوتا ہے۔ عصمت کی تحریر بڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساکت دریا میں ناؤ بڑے ہی پرسکون انداز سے بھی چلی جا رہی ہے اپنے آس پاس کی چیزوں کو غور سے دیکھتی محسوس کرتی اور سمجھتی ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے بے نیاز ہے مگر ہر چیز کی خبر رکھتے ہیں۔

”بڑی آبا بھی میکے کی روٹیوں سے تنگ آکر ایک اسکول میں لڑکیوں کو پڑھانے لگی تھیں۔ جوانی لہراتے پھنکارتے سانپ کی طرح پلک جھپکتے میں دوڑ گئی۔ کچھ لوگ ہی سی دھندلی لکیر باقی تھی۔ بوڑھی خراٹا سا اس کے منہ پر بار بار حقارت سے اس گزرے ہوئے سانپ کا تمسخر اڑاتی، وہ خوش تھی کہ بہو جلد از جلد بوڑھی ہو کر خطہ کی حدود سے نکل رہی تھی۔ اس لئے اس نے کمٹن زمانہ گزارنے کے لئے میکے بھیج دیا تھا کہ کچھ تو باپ بھیڑوں کی لالچ پیروں میں بیرہیاں ڈالے

رہے گی۔ وہ اب اسے اپنا ہم عصر سمجھنے لگی تھی، ل

ڈاکٹر احسن فاروقی نے عصمت چغتائی کی زبان اور انداز بیان کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے

”ان کی زبان میں بناوٹ نام کو نہیں معلوم ہوتی
وہ محض انجیل سے نبض کر قلم برداشتہ لکھتی جا رہی ہیں۔ مگر ان کا فقرہ
ہر جملہ ہر لفظ میں ایک برقی تیزی ہے جو پڑھنے والے کے دل کو ہلا دیتی

ہے۔“

جنوں گورکھپوری نے بھی اپنے ایک مضمون میں ان کی زبان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

”ان کو خاص طبقہ کی روزمرہ کی زبان پر الہامی قدرت

حاصل ہے۔ ایسی بے سکان زبان شکل ہی کسی کو نصیب ہو۔ وہ الفاظ

اور فقروں کے گویا طرارے بھرتی ہیں اور پڑھنے والا بعض اوقات ان

کا ساتھ نہیں دے سکتا ہے۔“

ڈاکٹر احسن فاروقی اور جنوں گورکھپوری کی ان آراء سے اختلاف کرنا گویا کسی حقیقت کو جھٹلانے

کے مصداق ہے کیوں کہ عصمت چغتائی کی زبان میں ایسا جادو ہے جو سر پر چڑھ کر بولتا

ہے اور اچھے اچھے زبانداؤں سے اپنی زبانداںی کا اعتراف کرایتا ہے۔

”نئے ادب کے معمار“ میں سعادت حسن منٹو لکھتے ہیں

”عصمت کا قلم اور اس کی زبان دونوں بہت

تیز ہیں۔ لکھنا شروع کر دے گی تو کئی مرتبہ اس کا دماغ آگے نکل جائے

گا اور الفاظ بہت پیچھے رہ جائیں گے۔“

گویا منٹو کے نزدیک عصمت چغتائی کی زبان ان کی فکر کی شدت اور رفتار کا ساتھ نہیں

دے پاتی۔ یہ بات کسی حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے۔ بعض مقامات پر قاری کو ایسا محسوس

۱۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ ڈاکٹر احسن فاروقی ص ۲۲۲-۲۲۳

۲۔ ادب اور زندگی جنوں گورکھپوری ص ۲۲۶

۳۔ نئے ادب کا معمار منٹو ص ۱۴

ہوتا ہے کہ عصمت کے تخلیقی ذہن کی توانائی اور ان کی فکر کی شدت اور رفتار کا ساتھ ان کی زبان نہیں دے پا رہی ہے لیکن اکثر مقامات پر وہ اپنی فکر کو نہایت کامیابی کے ساتھ الفاظ میں بیان کر دیتی ہیں۔ عزیز احمد کا خیال ہے

”ان کے طرز تحریر میں نسوانیت ہے یعنی وہ اس طرح لکھتی ہیں جیسے کوئی عورت اپنے نقطہ نظر سے لکھ رہی ہو۔ ذہنی طور پر مردہ بن کر نہ لکھ رہی ہو۔ اسلوب میں عورت کی چلتی ہوئی زبان کی سی روانی ہے اور اس پر انگریزی تحریر کا جلدت پسند اثر پڑا ہے“۔

سبشن پرشاد کول اردو کے بزرگ قلم کار تھے۔ موصوف کا شمار باقاعدہ ناقدین میں تو نہیں کیا جاتا لیکن ان کی کتاب ”نیا ادب“ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود اردو فکشن میں اپنی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں عصمت چغتائی کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے کشن پرشاد کول لکھتے ہیں۔۔۔

”عصمت چغتائی کے لکھنے کا ڈھنگ بڑا اچھا ہے، زبان اپنی ہے۔ انداز بیان کے کیا کہنے۔ حسن کاری کی جھلک ان کے افسانوں میں اکثر ایسی ہوتی ہے۔ کوئی نہ کوئی بات افسانے میں ایسی کہہ دیتی ہیں جو یاد رہ جاتی ہے۔ چونکہ خود عورت ہیں، عورتوں سے متعلق جو کچھ لکھتی ہیں اس میں سچائی بھی ہوتی ہے اور گہرائی بھی“۔

کشن پرشاد کول اگلے وقتوں کے لوگوں میں سے تھے جو زبان کے متعلق ایک خاص مزاج اور رائے رکھتے تھے ”لکھنے کا ڈھنگ بڑا اچھا ہے“ سے ان کی مراد عصمت کے اسلوب بیان کی خوبی کا اعتراف کہ ”زبان اپنی ہے“ کہہ کر انہوں نے زبان کے معاملے میں عصمت کی انفرادیت کو تسلیم کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عصمت زبان کے معاملے میں بے حد منفرد قلم کار ہیں۔ اور اس میدان میں کوئی دوسرا ان کی ہم سہری نہیں کر سکتا۔ معاصر ناقدین

میں آل احمد سرور بلند مقام رکھتے ہیں۔ زبان کے معانی میں آل احمد سرور اپنا جواب نہیں دیتے لیکن عصمت کی تخلیقی زبان کا اعتراف انہوں نے بھی واضح لفظوں میں کیا ہے۔

”ان کے یہاں ڈرامائی کیفیت، قصہ پن، کردار نگاری

مکالموں کی نفاست اور خوب صورتی نمایاں ہے مگر انہوں نے جو گہر بنو

بامی اورہ جاندار اور رچی ہوئی زبان استعمال کی ہے اس کی جدید

افسانوی لوب میں کوئی نظیر نہیں ہے“ ۱

عصمت کی تخلیقی زبان کی مثالیں ٹیڑھی بیکر کے کسی بھی صفحے سے دی جاسکتی ہیں۔ ان کا ایک ایک جملہ اپنا وزن اور حیثیت رکھتا ہے۔ ناول میں افسانے کا سا ایجاز و اختصار نہیں ہونا چاہئے۔ یہ عصمت خوب جانتی ہیں اور اپنے ناولوں میں اس کا خیال بھی رکھتی ہیں اور جہاں اس کی ضرورت محسوس کرتی ہیں۔ ایجاز و اختصار سے بھی خوب کام لیتی ہیں۔ شتمن ایک بار منجھو بی سے ناراض ہو کر کہتی ہے اللہ کرے منجھو بی کی شادی ہو جائے۔ اب عصمت کے قلم کا کمال دیکھئے

”دعا نہ جانے کیسے بُرے وقت سے نکلی تھی کہ جھٹ

قبول ہو گئی۔ کچھ ایسی گڑبڑ تھی کہ اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے

گھر اتھل پتھل ہو گیا۔ منجھو بی گھیر گھار کر ایک کمرے میں بٹھا دی گئی اور

خوب غل مچایا گیا۔ الٹی سیدھی مٹھائیاں اور زرق برق کپڑے چاروں

طرف پھیل گئے۔ اچھا خاصا گھوٹ بن گیا۔

گھر کی عورتیں لال ہرے کپڑوں میں لپٹ کر دوڑ پڑیں۔ دھواں دھواں

باجے بجنے لگے“ ۲

عصمت چغتائی کی تخلیقی نثر کی چند مثالیں اور ملاحظہ ہوں جن میں کرداروں کے عادات و اطوار ان کی نفسیات اور جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے مثلاً

نچلے طبقے کے کردار اور اعلیٰ طبقے کے کردار اور عالم و جاہل وغیرہ کی لفظیات میں جو فرق پایا جاتا ہے عصمت اسے کبھی نظر انداز نہیں کرتی ہیں۔

”اری رسول! رسول کہاں مر گئی۔ مالزادی! جا علی بخش سے کہہ کہ سودا نہیں لائے۔ ہاں جلدی سے لائیں، مونگ کی دال ادھ...
... اور بھنی ہوئی گرم گرم مونگ پھلیاں ہاں شمن جی کے لئے، اور شکر کی گولیاں بھی... نائیں میرا چاند، میرا کلیجے کا ٹکڑا...“

”چپ چڑیل، خبردار جو آواز نکالی۔ پاس کے پلنگ سے بڑی آہ غرائی۔ ادھ اب وہ کچھ گئی! سوتے میں ظالموں نے اے منجھو کے پاس سے اٹھا کر یہاں پھینک دیا... لے لے چڑیل جان کو آگئی ہے اس کی، ادھر چل اگر اب کے پلنگ سے اٹھی تو بس کالی کوٹھری میں بند کردوں گی۔ بڑی آپا نے گھسیٹ کر اس کی بانہہ پکڑ لی ادھ بھگاتی ہوئی لا کر پلنگ پر پٹخ گئی۔“

”بڑی آپا حیرت زدہ رہ گئی۔ اندھیر ہے کہ نہیں رائڈ بیوہ کا کسی کو خیال نہیں۔ لوگ اپنی بیٹیوں کے آگے یتیم کا حق بھی مارنے سے نہیں چوکتے۔ انہیں پورا یقین تھا کہ چچا سب سے پہلے حقدار کا خیال کریں گے۔ مگر فہمیدہ کو شمینداور احمد جی کی آنکھوں میں دھول جھونک کر لے اڑیں۔“

آرے شمن عباس کے لئے گرم پانی بھجوا دیا ہوتا کہ ڈھابا بی بی بیٹی ہوں نے ڈرتے ڈرتے کہا بڑی کا مزاج بڑا تیز تھا۔
”اے شمن خاک اتنا سوچیں گی... نوری؟ جاؤ تو ذرا میری بکلی

۲۷ ص عصمت چغتائی ٹیڑھی لکیر
۳۷ ص ” ”

کی انگلی پر پانی گرم کر کے اوپر لئے جاؤ، بڑی آپا بولیں۔
 مگر اس سے قبل کہ قوی پانی گرم کرتی چھوٹی ممانی منہ
 دھلو اور فخریہ عباس میاں کو لے کر اوپر سے اتر آئیں۔ سب کے سب منہ
 دیکھتے رہ گئے اور وہ مسکراتی ہوئی اسے کرسی پر بیٹھا کر پان لگانے لگیں۔

اے ہے لوگ یتیم بیوہ کا خون چوسنے سے بھی
 نہیں چوکتے۔ ارے بھی لوگوں کو تو بہت مل جائیں گے۔ یتیم کو جڑ جلے
 تو بہت جانوں۔ قرآن پاک میں بھی یہی نکھلے کہ پہلے یتیم بیوہ کا حق۔
 عورتوں کی زبان کے استعمال میں عصمت کو یہ طوطی حاصل ہے۔ ان کی تخلیقی نثر کا جو ہر دراصل
 اسی زبان میں کھلتا ہے۔ معمولی معمولی باتوں، حرکتوں، جذلوں اور کیفیتوں کا اظہار وہ اتنی
 سادگی اور رواں انداز میں کرتی چلی جاتی ہیں کہ پڑھ کر طبیعت شگفتہ ہو جاتی ہے۔ کرشن چندر
 جن کے افسانوں کی زبان کو اردو کے تقریباً سبھی نقادوں نے سراہا ہے اور جنہیں وارث علوی
 جیسے منہ پھٹ نقاد نے اردو افسانے کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا ہے عصمت چغتائی
 کے افسانوی مجموعے ”چوٹیں“ کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

”سیدھی سادی زبان جو کم و بیش شمالی ہند کے ہر گھر
 میں سمجھی جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی نسوانی تشبیہیں اور محاورے اور استعارہ
 شوخیاں اور چٹکیاں جو آپ ہی آپ اس نگار خانے میں خوب صورت
 گل بوٹے بناتی جاتی ہیں۔ ہر چیز اپنی جگہ پر خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔“

پطرس بخاری جنہوں نے عصمت کے نفس موضوع پر کہیں کہیں سخت تنقید بھی کی ہے۔ ان

۱	ڈیڑھی بکیر	عصمت چغتائی	ص ۱۵۶
۲	”	”	ص ۱۵۵
۳	چوٹیں کا دیباچہ	کرشن چندر	ص ۱۵

زبان کے مدارج ہیں اور اس معاملے میں عصمت چغتائی کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

”اردو میں مغربی تعلیمات روز بروز بڑھتی جاتی ہیں۔ چنانچہ عام مصنفوں میں بھی اور کچھ نہیں تو ترجمہ شدہ ترکیبوں کی گٹھیاں تو اکثر مل جاتی ہیں۔ عصمت انگریزی کے خیر و شر دونوں سے مبرا ہیں یہ تو بتانا ناممکن ہے کہ وہ کیا لطف ہے جو ان کی تحریر میں پیدا ہو جاتا اور اس پاکدامنی کی وجہ سے پیدا نہ ہو۔ بہت سے ایسے الفاظ کام میں لے آئی ہیں جو آج تک پردہ سے باہر نہ نکلے تھے اور جن کو اب انہوں نے نئے مطالب کے اظہار کے قابل بنادیا ہے۔ گویا ادھر اردو انشا کو ایک نئی جوانی نصیب ہوئی ادھر خانہ نشین الفاظ کو تازہ ہوا میں سانس اور روحانی ہے اور جملوں کا زبردست روزمرہ کا سا پھرتیلا زبردست ہے اس لئے ان کے فقروں کا سانس بھی نہیں پھرتا،“

پطرس بخاری کا یہ خیال بالکل درست ہے جو الفاظ اب تک پردہ میں تھے اب باہر کھلی ہوا میں سانس لیتے ہیں اور ان کو ایک نئی زندگی ملی ہے گھریلو ماحول اور زبان یوں تو اور خواتین قلم کاروں نے بھی استعمال کی ہے۔ مگر عصمت چغتائی کی بات ہی کچھ اور ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

”غرض ایسا معلوم ہوتا تھا میدان میں گھوڑے چھوٹ چکے۔ کبھی ایک آگے تو کبھی دوسرا آگے یا جیسے انٹر وید ہو رہا ہے لوگ اپنی اپنی سی کر چکے ہیں۔ نتیجے کا بے صبری سے انتظار ہے۔ جچی پیغام دے ہی نہیں چکتے اور نہ ہی منہ سے پھوٹتے ہیں۔ کھایا پیسا اور پیرپسا کر سو گئے اور یہاں سب کی نیندیں جرام ہیں۔“

معلوم ہوتا ہے ہر ایک کے دروازے پر بارات کھڑی ہے مگر درہا
اندر قدم نہیں رکھ چکتا، ۱۷

”اے بے نوج جو ہمارے زلمے کی لڑکیاں ایسی
بے شرم ہوتیں تو بے ہے۔ گریبان تو دیکھو سارا آگاہ بیچھا کھلا پڑا ہے،
جب دیکھو جب کھٹی کھٹی جب دیکھو دھما چو کڑی، لڑکیاں ہیں کہ گھوڑے“ ۱۸

”تو دیر تک شمتن رضیہ بیگم ہی کے متعلق سوچتی ہی
ان کی جوانی دھسل چکی تھی۔ پھر ان میں ایسی کون سی خطرناک ادا باقی رہ گئی
تھی جس نے مسٹر منجر کو بدحواس کر رکھا تھا۔ اگر کوئی جوان لڑکی ہوتی تو خیر
ایک بائیکاٹ تھی مگر اپنی ہم عمر اور نسبتاً بد صورت عورت میں انہیں کہاں سے
خطرہ نظر آ رہا تھا، ۱۹

بچوں گورکھ پوری نے عصمت چغتائی کے فن کو اشاریت کا فن قرار دیا ہے اس کی ان گنت
مثالیں ڈیڑھی لکیر کے صفحات پر جا بجا بکھری پڑی ہیں۔

”..... مگر سیٹل آؤ نہ تھا۔ اُسے کچے پھلوں سے نفرت تھی وہ

نہایت صبر سے پیڑ کے نیچے کھڑا ہونٹوں پر زبان پھیرا کرتا اور کھپل
کے پاک کر رس دار ہو جانے کا انتظار کرتا۔ یہاں تک کہ خود اس کی آغوش
میں رس کی بارش ہو جاتی۔ مجبوراً وہ اسے چکھ لیتا بائیکاٹ کی بددستی کی دعوت
سمجھ کر، ۲۰

مگر محیط بھیانہ جانے کن متعفن موریوں کی غلامت

۱۵۶	ص	عصمت چغتائی	ڈیڑھی لکیر	۱
۲۳۹	ص	”	”	۲
۲۷۹	ص	”	”	۳
۲۳۶	ص	”	”	۴

”اس کا یہ اثر ہوا کہ اناج ملنا بند ہو گیا۔ سانپ نے
پیچ و تاب کھانے شروع کئے اور کنڈلی مار کر ایک بار ہی دوکان میں
گھسنے کی کوشش کی“ ۱۷

”شمن کو ایسا معلوم ہوا اسکول میں نہیں کسی سنگ خانے
میں کھڑی ہے۔ دنیا نہیں بھوکے ننگوں کا ایک مستقل یتیم خانہ ہے جہاں
اوپر سے نیچے تک ہر ایک نڈھال ہے“ ۱۸

عصمت کی تحریر میں کہیں بھی تصنع محسوس نہیں ہوتا۔ ان کی نثر میں پہاڑی چشمے کی
سی روانی ہے جو اوڑھ بڑھ راستوں سے گزرتا ہوا اپنی راہ آپ بنا لیتا ہے اور اپنے اندر ایک
فطری دل کشی رکھتا ہے عصمت کی زبان پر اظہار خیال کرتے ہوئے مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں
”ان کی زبان کے متعلق تو کبھی دو رائیں نہیں ہو سکتی۔ ان

کو ایک خاص جوار اور ایک خاص طبقہ کی روزمرہ زبان پر الہامی قدرت
حاصل ہے۔ ایسی بے تکان زبان مشکل ہی سے کسی کو نصیب ہو سکتی

ہے وہ الفاظ اور فقرات کے گویا طرار سے بھرتی ہیں اور پڑھنے والا
بعض اوقات ان کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ عصمت کا اسلوب بیان

ایسا ہی ہے جیسے کوئی خواب میں بے اختیار بڑبڑا رہا ہو اور سننے والا
جو نفسیات خواب کا ماہر نہ ہو اس کے بڑبڑانے میں بہت سی خدائیں اور

بے ربطیاں محسوس کر رہا ہو۔ میں نے عصمت کے فن کو اشاریت سے

تعبیر کیا ہے۔ وہ مربوط اور مسلسل طور پر مکمل کر نہیں بتاتیں بلکہ بے ربط

اور اچانک اشاروں سے بہت کچھ سمجھا جاتی ہیں۔ ان کا سارا فن کچھ ”لحافی“

ہے جس کو سمجھنے کے لئے درک اور مہارت چاہئے“ ۱۹

خود
۱۷

۴۷۷	ص	عصمت چغتائی	ٹیڑھی لکیر	۱
۲۹۴	ص	”	”	۲
۳۲۲	ص	مجنوں گورکھپوری	نکات مجنوں	۳

مجموعی طور پر ڈیڑھی لکیر کی زبان ناول کی صحیح زبان ہے جس میں رنگینی بھی ہے
 غلاظت بھی، حسن بھی ہے اور فصیح بھی، سادگی بھی ہے اور پیچیدگی بھی، اس میں زندگی اور توانائی
 ہے یہ زبان شاعری کی زبان ہے واضح طور پر الگ ہے اور عصمت کی بے پناہ تخلیقی قوت کی نظر ہے

یڑھی لکیریں فلسفہ حیات

یہ دنیا بغیر مقصد پیدا نہیں ہوتی اور جو چیز بھی پیدا ہوتی ہے اس کا کچھ نہ کچھ مقصد و کام ضرور ہوتا ہے۔ اسی طرح جب ایک ادیب کچھ تخلیق کرنے کے لئے قلم اٹھاتا ہے اس وقت اس کے ذہن میں بھی کوئی مقصد یا کوئی پیغام چھپا ہوتا ہے۔ ہر شخص کے پاس اپنا نظریہ حیات ہوتا ہے۔ وہ اگر اعلیٰ ہے تو یقیناً اس کا مقصد بھی اعلیٰ ہوگا۔ یہی بات ایک ادیب کے لئے بھی کہی جاسکتی ہے۔ کوئی بھی ادیب بغیر سوچے سمجھے، بغیر کسی مقصد کے کچھ نہیں لکھتا۔ وہ فن کے پیرائے میں اپنے ارد گرد کی زندگی اور ماحول کی عکاسی کرتا ہے اور اسی کے ذریعہ اپنا نظریہ حیات پیش کرتا ہے۔ اردو ناولوں میں ابتداء ہی سے نظریہ حیات کی پیش کش کے عموماً دو طریقے شمال کئے جاتے رہے ہیں۔ اس میں سے ایک طریقہ وہ ہے جس میں ناول نگار اپنے کرداروں کے عمل اور رد عمل کے ساتھ ہی جگہ جگہ اپنی طرف سے اس ضمن میں اپنی رائے کا اظہار بھی کرتا جاتا ہے۔ اور اس عمل یا رد عمل کی اچھائی کی تعریف اور برائی پر لعنت ملامت بھی کرتا جاتا ہے۔ یہ رویہ نذیر احمد کے ناولوں میں جا بجا ملتا ہے۔ دوسرا رویہ یہ ہے کہ اس میں ناول نگار اپنے کرداروں کے عمل اور رد عمل کی فنکارانہ عکاسی پر خصوصی توجہ دیتا ہے اور اس سے اخذ ہونے والا نتیجہ قاری پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس طرح اس کے کردار آزاد ہوتے ہیں اور ناول کا قاری بھی نتیجہ اخذ کرنے کے معاملے میں بالکل آزاد ہوتا ہے اور جلد یا تاخیر اپنی سمجھ بوجھ سے اس نتیجے تک پہنچ جاتا ہے اور اس مخصوص نظریہ حیات کو پالیتا ہے جو مصنف کو مقصود ہے۔ یہ دوسرا طریقہ فنی لحاظ سے زیادہ مستحسن سمجھا جاتا ہے اور معروفی طریقہ کہلاتا ہے۔ رتن ناتھ سرشار کا فسانہ آزاد اس کی بہترین مثال ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ناولوں میں نظریہ حیات کی پیش کش کے ضمن میں مروجہ دونوں طریقے اردو ناول کے بالکل ابتدائی دور یعنی نذیر

احمد اور سرشار کے ناولوں سے لے کر دور حاضر تک کسی نہ کسی طور استعمال ہوتے رہے ہیں۔ ہر اچھے ناول نگار کی تصنیفات میں اس کا نظریہ حیات ضرور ابھرتا ہے۔ عصمت کے نظریہ حیات کے بارے میں زرینہ عقیل لکھتی ہیں۔

”وہ اس دور کے سماجی نظام سے منفرد ہیں جہاں بیہودہ رسم و رواج اور توہمات کا دور دورہ ہے جہاں لذت اندوزی مذہبی جنون، فرقہ پرستی، جہالت اور غربت زندگی کا لازمی جزو ہے جہاں سرمایہ داروں کا تشدد عام ہے۔ لہذا وہ اس نظام کی بدصورتی کے خلاف احتجاج کرتی ہیں۔ ایسا زبردست احتجاج کہ وہ مذہبی ریاکاری کا پردہ چاک کرنے سے بھی نہیں چوکتیں۔ مولوی، قاضی، علماء کسی کو بھی نہیں چھوڑتیں۔ وہ خالق ہوں کی تاریکیوں اور مذہبی شعبہ بازوں کو سماجی نقطہ نظر سے دیکھتی ہیں۔“ ط

عصمت نے زندگی کی کٹھوس حقیقت کو دیکھا سمجھا محسوس کیا اور اسے اپنے فن کے پردوں میں پیش کیا ہے وہ زندگی میں صرف خواب ہی نہیں دیکھتی بلکہ جو کچھ ہو رہا ہے اور اگر کچھ ہوتا ہے تو کیوں ہو رہا ہے اس بات پر بھی نظر رکھتی ہیں۔ ”ٹیڑھی لکیر“ کا سنہ اشاعت ۱۹۴۶ء

_____ ط یہ وہ دور ہے جب ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد اپنے عروج پر تھی۔ ہر طرف تعلیم کا دورہ تھا تعلیم نسواں پر بھی بہت زور دیا جا رہا تھا۔ ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ بے ار ہو چکا تھا۔ اگر نیر حکمران یہ بات سمجھ چکے تھے کہ اب ان کی حکومت بہت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکے گی۔ اس لئے وہ جاتے جاتے ہندوستانیوں کے ایسی اختلافات کو بڑھاتے اور انہیں ایک دوسرے کے خلاف بھڑکار رہے تھے۔

ادھر انجمن ترقی پسند مصنفین کے پرچم تلے لکھنے والے نوجوان شاعر و ادیب، غلامی

۱۔ اردو ناول میں سوشلزم زرینہ عقیل ص ۴۴۸

۲۔ الفاظ کراچی شمارہ ۱۹۸۵ میں ص ۱۲ ٹیڑھی لکیر کی اشاعت ۱۹۴۶ء

اردو ناول بیسویں صدی میں۔ عبدالسلام نے ٹیڑھی لکیر کی اشاعت ۱۹۴۵ء لکھی ہے

سماجی نابرابری، استحصال اور سماج کے بوسیدہ رسم و رواج سے بغاوت کرنے کے لئے لوگوں کو اکٹھا کرے تھے۔ عصمت نے ایسے ماحول میں یہ ناول لکھا تھا۔ چونکہ عصمت کا تعلق بھی ترقی پسند تحریک سے ہے اس لئے ان کا رویہ حقیقت پسندانہ رہا ہے۔ عصمت نے اپنے ناول کیڑھی بکیر میں شروع سے ہی حقیقت پسندی کا دامن لے رکھا ہے نہیں جانے دیا ہے۔

فلسفہ حیات کے بغیر ناول ادھر اور بے روح سمجھا جاتا ہے۔ ادیب فلسفہ حیات سے ناول میں معنویت پیدا کرتا ہے۔ ناول کے کرداروں کے عمل اور رد عمل سے مصنف کے نقطہ نظر کو سمجھا جاسکتا ہے وہ اپنے کرداروں کو کبھی تو ہمدردانہ انداز میں پیش کرتا ہے ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور بعض کرداروں کے ساتھ ہمدردی نہیں کرتا بلکہ کہیں کہیں تو ان کے ساتھ نفرت کا برملا اظہار کرتا ہے کہیں وہ شوخیانہ اشاروں سے کام لیتا ہے اور کہیں طنز کے حربے آزماتا ہے۔ پھر بدلتے ہوئے حالات اور ماحول کے ساتھ ساتھ ان میں پیدا ہونے والی خوشگوار اور ناخوشگوار تبدیلیوں کی عکاسی بھی کرتا ہے بقول احسن فاروقی

”فلسفہ حیات کی بھی ناول میں کافی اہمیت ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ناول نگار کوئی فلسفہ یا اخلاقی سبق اپنے ناول کے ذریعہ ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہو چونکہ ناول نگار کا منطقی نظر زندگی کو پیش کرتا ہے لہذا یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کی تصویر زندگی اس کے عام اخلاقی و فاسفی و مذہبی وغیرہ خیالات کی حامل نہ ہو۔ یہ ممکن ہے کہ ناول کے قصبے میں کوئی خاص نظریہ مضمر نہ ہو مگر پھر بھی ناول نگار زندگی کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ بعض چیزوں کو پسند اور بعض کو ناپسند کرتا ہے۔ اس لئے اس کے ناول میں ہم کو فلسفہ حیات کی بابت کچھ نہ کچھ اشارے ضرور ملتے ہیں۔ ہر ناول ایک فلسفہ حیات کا عکس پیش کرتا ہے خواہ وہ عکس کتنا دھندلا کیوں نہ ہو زندگی کے کچھ پہلوؤں کو روشن کرتا ہے اور بعض پہلوؤں کو کچھ تاریکی میں ڈالتا ہے۔“

روسی ناول خاص طور پر پیامی میں۔ ان میں حقیقت کا انکشاف
اسی صورت سے ہوتا ہے ہمارے قلوب انکسار، رحم اور محبت
سے بھر جاتے ہیں۔ ان میں کسی خاص قسم کے اخلاق پر وعظ نہیں
ہیں مگر ان کا اخلاق ہمارے دل میں جگہ کرتا ہے۔ " ۱

ڈیڑھی ٹیکر میں بھی کرداروں کے عمل رد عمل اور مکالموں کے ذریعہ عصمت نے
اپنے نظریہ حیات کا اظہار کیا ہے۔ وہ سماج کے رسم و رواج پر طنز کرتی ہیں۔ کبھی ہمارے
سماج میں عورت کی غیر اطمینان بخش حالت پر تبصرہ کرتی ہیں۔ اس ناول میں ان کے خیالات
جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں جنہیں یکجا کرنے کے بعد ہی صحیح تصویر سامنے آتی ہے۔ سلم
سماج میں عورت کو پردے میں رہنے کی ہدایت دی گئی ہے اور اس کی ہزاروں وجوہات
بتائی گئی ہیں۔ مگر عصمت کی نظر جہاں تک پہنچتی ہے وہ ان مذہبی احکامات کو آنکھ بند کر کے
قبول نہیں کرتیں بلکہ زندگی کے تجربات کی کسوٹی پر پرکھ کر ان کی قدر و قیمت معلوم کرتی
ہیں۔ شتمن آزادی کی قدر دان ہے۔ عورت کی آزادی کی علم بردار ہے لیکن جو بے پردگی
کی آزاد زندگی کے مضرت رساں نتائج پر غور کرتی ہے تو محسوس کرتی ہے کہ اس آزادی سے
تو پردے کی قید ہی زیادہ مفید رہے۔

"شتمن کو محسوس ہوا کہ یہ آزادی ہی تو قید ہے ٹھیک کہتے ہیں یہ
بوسیدہ لوگ عورت کو پردہ میں رہنا چاہئے۔ سچ تو ہے کتنے مزے
سے پردے میں آنکھ مچولی کھیلی جاسکتی ہے۔ جی چاہا جس سے چھپ گئے اور
جی چاہا جسے دکھایا۔ بد صورت تو خاص فائدہ میں رہتی ہونگی۔ جسے ہلکی
سی جھلک دکھادی وہی حسین سمجھ بیٹھا یہ تھوڑی کہ مقابل بیٹھے ہیں
اور ہر عیب سامنے رکھا دل دکھا رہا ہے" ۲

عصمت نے عورت کے پردہ فیشن ان کی مکاریوں، عورت کی محبت اور نفرت

کو جس بے باکی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کا جواب ڈھونڈنا مشکل ہے۔ عصمت نے عورت ہوتے ہوئے عورت کی کمزوریوں کا پردہ فاش کیا ہے اور جس بے باکی سے عورت کے مسائل و معاملات کو بیان کیا ہے یہ کام صرف عورت بلکہ ایک حساس عورت ہی کر سکتی ہے۔ ایک جگہ انہوں نے عورت کی زندگی کے مقصد پر غور و خوض کرتے ہوئے نہایت بے باکی کے ساتھ یہ سوال اٹھانے کی سعی کی ہے کہ کیا عورت کا وجود بھی اشیائے خورد و نوش کی طرح صرف مرد کے استعمال کی شے ہے یا اس کے علاوہ بھی اس کے کچھ معنی ہیں؟

”نوری خواب بیداری سے جی سیر کر کے سو بھی گئی مگر شمن نے اس کا سراپے بازو سے نہ ہٹایا اس کا نرم گرم جسم خوابوں سے رنگین چہرہ، ابلٹنے میں بے ہوشے سیلے کپڑے، وہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔ عورت! کیا یہی تھی۔ عورت جو حلوے کی مرغین قاب کی طرح سجا بنا کر کل ایک نئے مہمان کے سپرد کی جانے والی تھی۔ اسے نہلا دھلا کر عطر میں بایا جائیگا کہ اگر تھوڑی بساند بھی تو معلوم نہ پڑے۔ ایسے ہی جیسے سڑے گلے آلود کی چاٹ بننے والا تلخی چھپانے کے لئے ڈھیر سا سالہ چھڑک دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح دہن کو شیرے میں لتھیر کر دو لہا کے حلق میں اتار دیا جائے گا۔“ ط

مسلم معاشرے میں شادی کے سلسلے میں مہر کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ شادی بغیر مہر کے ادا ہو سکی اور نامکمل ہے۔ مہر کی رقم شادی کے لئے کیوں رکھی گئی ہے اس کے بارے میں سمجھی جاتے ہیں۔ مگر عصمت کا خیال ان سبھی سے الگ متعلق عجیب و غریب اور قابل غور ہے۔

”اسے نوری بالکل گلے سیل کی طرح لگ رہی تھی۔ اکیاون ہزار میں وہ اپنی جوانی کا سودا کر کے ایک مرد کے ساتھ جا رہی تھی بے وقوفی کی طرح نہیں۔ پکا کاغذ لکھا کہ اگر وہ بعد میں تڑپے تو ادا

پھندا اس کے گلے میں تنگ ہوتا جائے اور وہ چند بھی ڈھول
 تاشے سے لے خرید کر لے جا رہا تھا۔ آخر فرق ہی کیا ہے اس سودے
 میں اور آئے دن جو چاڈری میں خرید و فروخت ہوتی رہتی ہے وہ
 چھوٹا ٹکڑیو پارہے جیسے کچالو، پکڑیوں کی چاٹ اور یہ لمبا ٹھیکہ
 ہے جب تک فریق خیانت نہ کرے۔ یہ پار چلتا رہتا ہے ورنہ سودا
 بھٹ یہی نوری۔ یہ کم عمر انھڑ لڑکی اس کی ہستی میں
 ایسے گہرے نیچے گاڑے گی کہ وہ دنیا کو چھوڑ چھاڑ اس کے ہاتھ میں
 لگام دے کر اسی کے چلائے راستے پر چلتا چلا جائے گا۔ حیف ہے
 کہ یہ مرد عورت کو پیر کی جوتی، ناقص العقل اور نہ جانے کیا کہتے
 ہیں۔ مگر یہ جوتی ان کے سر پر بچتی ہے تو احساسِ خودی بھی فنا ہو چکتا
 ہے۔ اے سارے مرد مظلوم نظر آنے لگے اور ساری سونے روپے
 میں لدی ہوئی بیویاں ظالم جو ان کی کمائی پر بالکل اسی طرح قابض
 تھیں جیسے خون چوسنے والے سرمایہ دار غریبوں کی مشقت پر وہ
 اپنے جسم کی قیمت لیتی تھیں بجائے درجنوں کے صرف
 ایک سے پھر یہ مرد عورت کو کمزور کیوں کہتے ہیں شاید
 اس طرح خود ان کی کمزوری آڑ میں چھپ جاتی ہے۔ ظالم کبھی پکار پکار
 کر اپنے ظلم کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتا۔ بزدل ہی شیر کی طرح گونج کر
 دل کی بھڑاس نکالتے ہیں مگر عورت؟ عورت اس حاکم کی طرح ہے جو
 "پر جا کا چاکر" بن کر انہیں التو بناتی ہے۔ اس کی چالیں کس قدر
 خطرناک اور پر اسرار ہیں! بجائے شرمندگی کے اسے اپنی نسوانیت
 ایک بلند چیز نظر آنے لگی۔ "ط

عورت مرد کے ازدواجی تعلقات کی بابت اس انداز میں غور و فکر نہیں عصمت کی ٹیڑھی ٹکیر

سے پہلے کسی اور ناول میں نہیں ملتا۔ وہ شادی اور اس سے پیدا ہونے والے تمام مسائل سے پوری طرح واقفیت رکھتی ہیں۔ انہیں بظاہر مظلوم نظر آنے والی عورت کی تمام کمزوریوں کے ساتھ ساتھ اس کی طاقت اور اس کے اس ظالمانہ سلوک کا بھی صحیح صحیح اندازہ ہے۔ جو عورتیں شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ روارکھتی ہیں۔ عصمت کی تیز نظر میں بظاہر سخت اور ظالم نظر آنے والے مردوں کی کمزوریاں ان کی نرمی اور ان کی نامعابت اندیشی کا جائزہ لئے بغیر نہیں رہتیں۔ اس اعتبار سے انہوں نے جس بے لاگ انداز میں جرأت مندی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ صرف ان کا فائدہ ہے۔ عورت کی کمزوریوں کا اس کی چھپی ہوئی خواہشوں کا بیان عصمت نے اس طرح سے کھل کر کیا ہے کہ کبھی کبھی غصہ بھی آتا ہے کہ یہ سچائی جو پردے میں تھی صف نازک کی وراثت تھی۔ عصمت نے سب کے سامنے کیوں پیش کر دی یہاں ”گھر کا بھیدی لنکا ڈھلے“ والی کہادت صادق آتی ہے۔ عصمت نے جرأت مندی سے اس کا اظہار کیا ہے۔ مردادیوں نے عورتوں کے نہاں خانوں میں جھانک کر ان کے بارے میں سب کچھ جاننے کا دعویٰ بھی کیا ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ عصمت کے بیان کی گہرائی تک نہ پہنچ سکے جہاں تک عصمت پہنچی ہیں اور کامیاب ہوئی ہیں۔ شاید اس کی وجہ عصمت کا عورت ہونا بھی ہو۔

ترقی پسند
تحریک

ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں ہر پڑھا لکھا نوجوان ترقی پسند گروہ میں شامل ہونے کا خواہاں تھا اور موڈرن کہلانے میں عزت محسوس کرتا تھا۔ ترقی پسند تحریک ایک وبا کی طرح پھیل رہی تھی۔ ہر انسان جو اپنی سوچ میں تھوڑا بہت جدید یا بغاوت پسند خود کو ترقی پسند کہلانے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ عصمت نے ترقی پسندوں کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں اپنے مخصوص طنز بیان سے ان پر تنقید بھی کی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ اس میں کس کی اور کس کا ذکر بھی موجود ہے۔ ناول کا یہ حصہ نوجوان ترقی پسندوں کی خوش فہمیوں پر ایک گہری چوڑ ہے۔ عصمت خود بھی ترقی پسند ہیں اور آج بھی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہیں۔ اس لئے ان کے بیان کو دیانت دارانہ محاسبے سے تعبیر کرنا غلط نہ ہوگا۔ اگر کے ذریعے وہ محض اتنا واضح کرتا چاہتی ہیں کہ زندگی میں خواب اور حقائق دونوں الگ الگ چیزیں ہیں اور زندگی کے دھارے کو کسی خاص منصوبے کے تحت یکسر بدلتا از حد دشوار

بلکہ ناممکن بات ہے۔

”ترقی پسند گروہ کی ہرٹینگ زیادہ دل چسپ ہوتی گئی جتنے ممبر تھے سب ہی حقیقی پر جان رکھنے کام کو تیار تھے۔ زیادہ تر ایسے لوگوں کی تعداد تھی جو دل شکستہ اور تقدیر کے ٹھکرائے ہوئے تھے اور زندگی کی تلخیوں سے دوچار ہو چکے تھے۔ احمد کو ایک عیسائی لڑکی سے عشق ہو گیا تھا جو انتہائی بے رحمی سے منہ موڑ کر ایک پروفیسر کی ہو رہی۔ رحمان اپنی چچا زاد بہن کے عشق میں گرفتار تھا جس کے لالچی باپ نے اسے صرف اس لئے ٹھکرا دیا تھا کہ وہ سرکاری نوکری نہ حاصل کر سکا تھا اور وطن پرستی کا غزم کر چکا تھا۔ اسی طرح ایک شاعر تھے انور جو عشق میں ناکام سیاب ہو چکے تھے۔ ان کی شاعری انقلابی ہوتی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس اب انقلاب آنے ہی والا ہے۔ یہ شاعر سماج میں طبقاتی رشتوں کو ختم کرنا چاہتا تھا اور ایک ایسے سماج کی بنیاد رکھنا چاہتا تھا جس میں اس کی مجبورہ اسے مل سکتی۔ بس یہ اسی ایک مصرف کے لئے ترقی پسندی کے قائل تھے کہ جو جس سے چاہے شادی کرے۔“

درجب ایسا نظام آئے گا تو بقول عصمت

”اس وقت وہ اس لڑکی سے جی کھول کر محبت کرے گا اور اس کی

مشکلیں چوٹی کو حسین راتوں کی خاموشیوں میں کھول کر قضا میں خوشبو

پھیلارے گا۔ پھر کیا ہوگا؟ پھر یہ نہیں کیا ہوگا۔“

ترقی پسند گروہ میں جتنے لوگ تھے ان کے ساتھ ان کی داستانیں وابستہ تھیں۔ وہ بھی ترقی پسند اس لئے نہیں ہوتے تھے کہ وہ سماج میں سدھار لانے کے خواہش مند تھے بلکہ

وہ اپنے اور صرف اپنے لئے ہی آزادی چاہتے تھے اپنا فائدہ چاہتے تھے اس سچائی کو عصمت نے ترقی پسند گروہ میں رہ کر بیان کیا اس قسم کے لوگ ہی ترقی پسند بنتے تھے اور یہی لوگ اس تحریک کو بنیام کر رہے تھے۔ اسی طرح کے ایک اور کارکن کا ذکر عصمت یوں کرتی ہیں۔

”اس کے علاوہ وہ آنت دھما جس پر شہر کی کل طوائفیں عاشق تھیں وہ ان کے یہاں مفت جاتا تھا۔ شراب ہر فن کار کے لئے ضروری ہوتی ہے اور وہ ایک سچا فن کار تھا۔ کچھ سال تراجم چھپوانے کے بعد وہ طبع زاد کہانیاں لکھنے لگا تھا اور آٹا کہتے تھے کہ بہت جلد وہ بہت درجہ مصنفوں کی صف میں آگے آگے نظر آئے گا۔“ ط

اس بیان میں روئے سخن کس کی طرف ہے یہ کہنے کی غالباً ضرورت نہیں ہے۔ عصمت نے اس بیان میں اسی طرح چند اور ہم عصروں کے بھی کامیاب خلعے اٹائے ہیں۔

”برکت عجیب جنونی تھا۔ وہ تاریخ میں ایم۔ اے کر رہا تھا مگر اس کا زیادہ وقت جنسیات کے متعلق مواد فراہم کرنے میں صرف ہوتا تھا۔ جیمس جوائس اور ڈی۔ ایچ لارنس تو اس کے رومانی دیوتا تھے۔ جن کا وہ ہر قدم پر حوالہ دیتا اور جنسی آزادی کو سماج سے بھی زیادہ اہم سمجھنے لگا تھا۔“ ۲

عصمت کے ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ وہ ان چیزوں کو مستحسن نہیں سمجھتی بلکہ ان کی مضحکہ خیزی کو اور بھی اجاگر کرتی ہیں کیوں کہ وہ جانتی ہیں کہ فن میں حقیقی زندگی کی پیش کش مضمون کتابی مطالعے کے بل پر ممکن نہیں بلکہ اس کے لئے حقیقی زندگی اور اس

کے نشیب و فراز اور اسرار و رموز کا مطالعہ ضروری ہوتا ہے اور یہ چیز کتابیں نہیں سکھاتیں بلکہ زندگی کے سچے تجربے ہی سکھاتے ہیں۔

۵
بچوں کی
نفسیات

بچوں کے متعلق عصمت کا نظریہ صاف اور ظاہر ہے۔ شمن کی پرورش جس ماحول میں جس طریقہ سے ہوئی ہے وہ غلط ہے۔ عصمت نے قریب ۸۵ - ۸۶ صفحات تک بچوں کی نفسیات، بچوں کی عادات، بچوں کی خواہشات اور بچوں کی پرورش کا بیان سچائی کے ساتھ کیا ہے۔ یہ عصمت کا گہرا مشاہدہ ہی تھا جو وہ اس قدر سچائی سے ان سب کا بیان کر گئیں۔ انہوں نے بچوں کی نفسیات پر خاص طور سے زور دیا ہے۔ اس ناول کی ہیروئن شمن کا بار بار بھٹک جانا، غلط عادتوں کا اپنانا اور چاہت کی خواہش کی تکمیل کے لئے "بزرگ رائے صاحب" تک سے محبت کا اظہار کر بیٹھنا اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے وقت کی گئی لا پرواہیوں کی طرف واضح اشارہ ہے۔ شمن کے متعلق تمام باتیں باریکی اور تفصیل سے بیان کر کے عصمت یہ بتانا چاہتی ہیں کہ ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی غلط باتیں اور غلط رویے کس حد تک خطرناک ہو سکتے ہیں۔ عصمت نے بچوں کی پرورش اور ان کی تربیت میں لا پرواہی برتنے کا ایک غلط نظریہ پیش کر کے صحیح راستے کی تلاش کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ ایک اچھے ناول نگار کا فرض ہے کہ وہ پڑھنے والوں کو کچھ سوچنے پر مجبور کرے اور فکر و عمل کی دعوت دے۔ عصمت اس مقصد میں کامیاب نظر آتی ہیں۔

عصمت نے مذہب اور خدا کو بھی نہیں بخشا۔ وہ مذہب کے روایتی کردار سے بھی نالاں ہیں۔

۵
اس مذہب کا تو
دیوے سے بھی نالاں ہیں۔

"شمن نہ جانے کیسے میری آرزو ہے۔ میں محبت کروں مجھے کسی چیز پر یقین نہیں رہا اور خدا کے وجود پر ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔ محبت سے مجھے گھن آتی ہے اور خدا پر غصہ کہ وہ کیوں ہے؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟ مانا کہ یہ دنیا اس نے بتائی تو ہم پر کیا اصرار کیا اے سجدے کرانے کا اتنا کیوں شوق ہے اور جو نہ کرو تو دوزخ میں جلائے کی دھمکیاں دیتا ہے۔ سچ بتاؤ یہ کبھی بھنگی دنیا

۵
یہ الفاظ
اختیار
ہیں

۱۹۵
 تمہیں پسند ہے؟ کہیں اونچائی ہے تو ضرورت سے زیادہ،
 پستی ہے تو انتہا سے زیادہ، پانی ہے تو پانی ہی چلا گیا ہے اور پھر
 خشکی ہے تو وہ کم نحت بے تنگی جی چاہتا ہے اس دنیا کے گولے کو
 دونوں ہاتھوں گوندھ ڈالوں اور پھر اتنی سبک اور نفیس دنیا بناؤں
 کہ لوگ پیدا ہو کر بھی خوش ہو جائیں۔“

اس ناول میں عصمت نے لکچر نہیں دیا، اصلاح نہیں کی صحیح راستہ نہیں دکھایا بلکہ ملنر
 کیا ہے مذاق اڑایا ہے اور اکثر مقامات پر انتہائی سنجیدگی کا رویہ اختیار کیا ہے
 اور اس طور پر قاری کو کچھ سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ یہی ان کی خوبی ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ عصمت چغتائی کی ٹیڑھی نیکر دھند میں کھوئی ہوئی کوئی
 مبہم تصویر نہیں بلکہ زندگی کی حقیقتوں سے برسرِ واضح نظریہ حیات سے پُر ایک تصنیف ہے
 جو مدتوں یاد رکھی جائے گی۔

عصمت و پختنائی کی تصنیف کی فہرست

ناول اور ناولٹ

۱۹۳۰-۳۱	(ناولٹ)	۱۔ ضدی ✓
۱۹۳۲	(ناول)	۲۔ ٹیڑھی لکیر ✓
۱۹۶۲	(ناول)	۳۔ معصومہ ✓
۱۹۶۴	(ناولٹ)	۴۔ سودائی ✓
۱۹۶۸	(ناولٹ)	۵۔ جنگلی کبوتر
	(ناولٹ)	۶۔ دل کی دنیا
	(ناولٹ)	۷۔ عجیب آدمی ✓
۱۹۷۰	(ناول)	۸۔ ایک قطرہ خون
	(ناولٹ)	۹۔ باندی
	(بچوں کا ناول)	۱۰۔ نقلی راجہ مار
	(بچوں کا ناول)	۱۱۔ تین اناڑی

رپورتاژ

۱۔ بہی سے بھوپال تک

مضامین

- ۱۔ پوم پوم ڈارلنگ
- ۲۔ کیا موجودہ ادب رو بہ تنزل ہے۔
- ۳۔ کہانی
- ۴۔ کدھر جائیں
- ۵۔ بیچاری عورت
- ۶۔ بنے بھائی

۷۔ لال چوہنٹے

۸۔ ایک بات

۹۔ ہیر و سن

چوٹیں (افسانوی مجموعہ)

۱۔ ✓ بھول بھلیاں

۲۔ پنکچر

۳۔ ✓ ساس

۴۔ سفر میں

۵۔ اس کے خواب

۶۔ جنازے

۷۔ لحاف

۸۔ بیمار

۹۔ میرا بچہ

۱۰۔ تل

۱۱۔ چھوٹی ٹاپا

۱۲۔ جھری میں سے

۱۳۔ ایک شوہر کی خاطر

۱۴۔ دوزخی

۱۵۔ عورت اور مرد (ڈرامہ)

ایک بات (افسانوی مجموعہ) افسانوں کے نام

۱۹۴۲ء

- ۱- ننھی سی جان
- ۲- نفرت
- ۳- جال
- ۴- ہیرو
- ۵- بیڑیاں
- ۶- پسینہ
- ۷- بادرجی
- ۸- ایک شوہر کی خاطر
- ۹- چوتھی کاجوڑا
- ۱۰- ایک بات (مضمون)
- ۱۱- لال چیونٹے (مضمون)
- ۱۲- ہیروئن (مضمون)

۱۹۷۹ء

بدن کی خوشبو (افسانوی مجموعہ) افسانوں کے نام

- ۱- بدن کی خوشبو
- ۲- چارپائی
- ۳- گھونگٹ
- ۴- ہندوستان چھوڑ دو
- ۵- روشن
- ۶- خدمت گار
- ۷- کارساز

چھوٹی موٹی (افسانوی مجموعہ) افسانوں کے نام ۱۹۵۲ء

- ۱- بہو بیٹیاں
- ۲- کیڈل کورٹ
- ۳- سونے کا انڈا
- ۴- چھوٹی موٹی

دو ہاتھ (افسانوی مجموعہ) افسانوں کے نام ۱۹۵۵ء

- ۱- دو ہاتھ
- ۲- یار
- ۳- بے کار
- ۴- بچھو پھوپھی
- ۵- کلو کی ماں
- ۶- نیند
- ۷- کنواری
- ۸- چٹان
- ۹- چوتھی کا جوڑا
- ۱۰- عشق پر زور نہیں

کلیاں افسانوں اور ڈراموں کے نام

- ۱- پردے کے پیچھے
- ۲- کندا
- ۳- شادی
- ۴- انتخاب (ڈرامہ)

جوانی	-۵
ڈائن	-۶
سانپ (ڈرامہ)	-۷
فسادی (ڈرامہ)	-۸
ڈھیٹ (ڈرامہ - مکالماتی)	-۹
خدمت گار	-۱۰
بچپن (مضمون)	-۱۱
تاریکی	-۱۲
کافر	-۱۳
نیرا	-۱۴
اُن بچے	-۱۵

ڈرامے

عورت اور مرد	-۱
فسادی	-۲
سانپ	-۳
پردے کے پیچھے سے	-۴
انتخاب	-۵
بنے	-۶
ڈھیٹ	-۷

ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ	-۱
--------------------------	----

شیطان

کتابتیا

کتاب کا نام مصنف ناشر سن اشاعت

- ۱- اردو ناول نگاری سہیل بخاری انجمن پبلیشرز دہلی بار اول ۱۹۷۲
- ۲- اردو ناول کی تاریخ و تنقید علی عباس حسینی انبیرین بکڈ پوٹکھنؤ ۱۹۵۰
- ۳- اردو ناول آزادی کے بعد ڈاکٹر اسلم آزاد نگہار پبلیشرز مونا منہ بھن (پو) طبع اول ۱۹۸۱
- ۴- اردو ناول میں سوشلزم زربینہ عقیل احمد کتابستان الہ آباد اول ۱۹۸۲
- ۵- ادب اور نفسیات دیویندر استر مکتبہ شاہراہ دہلی پہلی بار اپریل ۱۹۶۳
- ۶- اردو ناول کی تنقیدی تاریخ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ادارہ فروغ اردو این آباد بکھنؤ میسر ایڈیشن ۱۹۸۱
- ۷- اردو ادب کی ایک صدی سید عبداللہ چین بکڈ پوار دو بازار دہلی
- ۸- اردو ناول کا نگار خانہ کے کے کھلر سیمانت پریکاشن دہلی ۱۹۸۳
- ۹- ادب کا مطالعہ اطہر پرویز ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ بار دوم بعدیم فردری ۱۹۸۰
- ۱۰- ادب اور زندگی مجنوں گورکھپوری اردو گھر علی گڑھ ۱۹۶۵
- ۱۱- اردو افسانہ روایت گوپی چند نارنگ ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس نئی دہلی ۱۹۸۱
- اور مسائل
- ۱۲- انداز نظر صفیہ اختر علوی بکڈ پو محمد علی روڈ ممبئی ۱۹۶۰
- ۱۳- اردو ناول بیسویں صدی میں پروفیسر عبدالسلام اردو اکیڈمی سندھ کراچی بار اول اکتوبر ۱۹۷۳
- ۱۴- اردو ناول پریم چند کے بعد ہارون ایوب لکھنؤ بار اول ۱۹۷۸
- ۱۵- بیسویں صدی میں اردو ناول یوسف سمرمت حیدر آباد بار اول ۱۹۶۹
- ۱۶- پریم چند کی ناول نگاری ڈاکٹر یوسف سمرمت خورشید پریس چھتہ بازار بار دوم ۱۹۸۶
- ۱۷- پریم چند کے نسوانی کردار شمیم نکہت بے شراک پوپی اردو اکیڈمی لکھنؤ اول ۱۹۷۵
- ۱۸- ترقی پسند ادب ایک جائزہ ہنسراج رہبر آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی بار اول ۱۹۶۷
- ۱۹- ترقی پسند ادب سردار جعفری انجمن ترقی اردو سندھ علی گڑھ بار اول ۱۹۵۱
- ۲۰- تلاش توازن قمر ربیس ادارہ خیر پبلیشرز حوض قاضی دہلی اول ۱۹۶۸

- ۲۱۔ تنقیدی اشارے آل احمد سرور ادارہ فروغ اردو مجلہ - این آباد پارک لکھنؤ
- ۲۲۔ ترقی پسند ادب عزیز احمد عارف پبلشنگ ہاؤس کلاں محل دہلی۔ بار اول ۱۹۴۵
- ۲۳۔ تحلیل نفسی کے بیچ و خم ڈاکٹر سلامت شاہین بک اسٹال مہری نگر کتب خانہ مکتبہ جامعہ نئی دہلی پہلی بار ۱۹۸۲
- ۲۴۔ تنقیدی زاویے ڈاکٹر عزیز احمد شاہین بک اسٹال مہری نگر کتب خانہ مکتبہ جامعہ نئی دہلی بار اول ۱۹۶۰
- ۲۵۔ ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ ڈاکٹر صادق اردو مجلس، ۶۷ بازار چٹلی دہلی۔ ۱۹۸۱
- ۲۶۔ تنقید کیا ہے پروفیسر آل احمد نثر جمال پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۷۲
- ۲۷۔ ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر قمر رئیس نیا سفر پبلیکیشنز نئی دہلی ۱۹۸۸
- ۲۸۔ تنقیدی مطالعے ڈاکٹر شارب دہلوی نصرت پبلیشرز حیدری مارکیٹ لکھنؤ
- ۲۹۔ جنس کا نفسیاتی پہلو سید قاسم مکتبہ جدید لاہور بار اول ۱۹۶۱
- ۳۰۔ داستان افسانے تک وقار عظیم سلطانیہ بک ڈپو قاسم جان اسٹریٹ دہلی۔ ۱۹۶۶
- ۳۱۔ رتن ناتھ سرشار ڈاکٹر قمر رئیس ساہتیہ اکادمی بار اول ۱۹۸۳
- ۳۲۔ شخصیات اور واقعات جنہوں نے مجھے متاثر کیا جنید احمد جنید احمد بک ہاؤس بمبئی شمشاد اختر ۷۷ سیکینڈ فلور میر بخش علی اسٹریٹ مدراس ۱۹۸۰
- ۳۳۔ کردار اور کردار نگاری ڈاکٹر نجم الہدیٰ نسیم بک ڈپو - لاٹوش روڈ لکھنؤ
- ۳۴۔ صفی مرتضیٰ صفی مرتضیٰ
- ۳۵۔ کردار کردار
- ۳۶۔ ڈکشنری آف سائیکالوجی جیمس ڈرون پن گوئن بک ۱۹۶۸

- ۲۷۔ مرزا رسوا آدم شیخ نسیم بکڈپو لاٹوشس روڈ لکھنؤ اول ۱۹۶۸
- ۲۸۔ نذیر احمد شخصیت اور کارنامہ ڈاکٹر اشفاق احمد مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی اول ۱۹۷۴
- ۲۹۔ ناول کیا ہے ڈاکٹر محمد حسن فاروقی نسیم بکڈپو لاٹوشس روڈ لکھنؤ چھٹا ایڈیشن ۱۹۸۳
- ۳۰۔ ناول کافن ترجمہ ابوالکلام قاسمی ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ بار اول ۱۹۷۸
- ۳۱۔ نیا ادب ابن پرشاد کول کتابستان اسرار گری پریس الہ آباد مارچ ۱۹۴۹
- ۳۲۔ نکات مجنوں مجنوں گورکھپوری کتابستان اسرار گری پریس الہ آباد اکتوبر ۱۹۵۷
- ۳۳۔ نئے ادب میں غور ہنس راج رہبر آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی بار اول ۱۹۶۷
- ۳۴۔ نئے ادب کے معمار سعادت حسن منٹو
- ۳۵۔ ہم اور ہماری نفسیات مرتضیٰ شفیع بمبئی ایجوکیشنل ۱۹۳۸
- ۳۶۔ ایک قطرہ خون عصمت چغتائی بکڈپو اسکول روڈ حیدر آباد فن اور فن کار ۴۹۔ محمد علی روڈ بمبئی ۱۹۷۷
- ۳۷۔ ٹیڑھی لکیر عصمت شاہد لطیف کتاب کار رام پور۔ مئی ۱۹۴۴
- ۳۸۔ جنگلی کبوتر عصمت چغتائی
- ۳۹۔ دل کی دنیا عصمت چغتائی
- ۴۰۔ سودائی عصمت چغتائی
- ۴۱۔ ہندی عصمت چغتائی
- ۴۲۔ عجیب آدمی عصمت چغتائی
- ۴۳۔ معصومہ عصمت چغتائی
- ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ
- صفیہ پاکٹ بکس پرائیویٹ لمیٹڈ دہلی
- اسٹار پبلیکیشنز دریا گنج دہلی
- ۱۹۶۲

رسالے

لاہور	۱۹۴۵ء	جنوری	۱- ادبی دنیا ماہنامہ
لاہور	۱۹۴۰ء	فروری مارچ	۲- ادبی دنیا ماہنامہ
	۱۹۴۴ء	مارچ	۳- بیسویں صدی
			۴- بیسویں صدی
	۱۹۳۸ء	سالنامہ	۵- ساقی ماہنامہ
	۱۹۸۰ء	مارچ	۶- ساقی ماہنامہ
	۱۹۳۸ء	اپریل	۷- ساقی ماہنامہ
	۱۹۶۵ء	فروری	۸- ساقی ماہنامہ
	۱۹۶۷ء	مارچ	۹- شب خون
	۱۹۶۶ء	اکتوبر	۱۰- شب خون
	۱۹۶۳ء	ستمبر	۱۱- کتاب
لکھنؤ	۱۹۷۶ء		۱۲- آج کل ماہنامہ
دہلی	۱۹۴۱ء		۱۳- ادب لطیف ماہنامہ
لاہور	۱۹۴۳ء	جنوری	۱۴- ادب لطیف ماہنامہ
لاہور	۱۹۴۲ء	جون	۱۵- ادیب ماہنامہ
دہلی	۱۹۶۳ء	جنوری	۱۶- کتاب ماہنامہ
	۱۹۶۴ء	جنوری	۱۷- کتاب ماہنامہ
	۱۹۶۵ء	مئی	۱۸- کتاب ماہنامہ
	۱۹۰۷ء	ستمبر	۱۹- مخزن ماہنامہ
	۱۹۴۹ء	اپریل	۲۰- نگار
	۱۹۵۰ء	دسمبر	۲۱- نگار
	۱۹۵۹ء		۲۲- نقوش

سالے

۲۳-	نگار	ماہنامہ	اکتوبر	۱۹۳۰ء	
۲۴-	نگار	ماہنامہ	دسمبر	۱۹۵۰ء	
۲۵-	نقوش			۱۹۵۲ء	افسانہ نمبر
۲۶-	نقوش				شخصیت نمبر
۲۷-	نقوش				ادب عالیہ نمبر
۲۸-	نقوش				مکاتیب نمبر
۲۹-	نیادور	ماہنامہ	شمار ۳۳-۳۴		کراچی
۳۰-	نیرنگ خیال		اپریل	۱۹۳۲ء	لاہور
۳۱-	نیرنگ خیال		دسمبر	۱۹۳۲ء	لاہور
۳۲-	نیرنگ خیال		جون	۱۹۳۳ء	لاہور